فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	نعیم احمد	۴

قرآنیات

البیان: الرعد ۱۳: ۱۴-۱۶ (۲)	جاوید احمد غامدی	۵

معارف نبوی

اللہ کے ذکر کے بغیر کہی ہوئی بات کا ناپسندیدہ ہونا	امین احسن اصلاحی	۷
سیدنا صدیق اکبر... معیت خداوندی و نبوی	شاہد رضا	۱۰

مقامات

ریاست اور حکومت	جاوید احمد غامدی	۱۷

سیر و سوانح

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ (۴)	محمد وسیم اختر مفتی	۲۱

مقالات

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر	شبلی نعمانی	۲۹

نقد و نظر

جوابی بیانیوں کا پس و پیش	ساجد حمید	۳۶

یسئلون

حکومت اسلامی کے قیام کی شرط اول	امین احسن اصلاحی	۴۱

وفیات

مولانا ابوالکلام آزاد	امین احسن اصلاحی	۴۶

ادبیات

غزل	جاوید احمد غامدی	۴۹

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نعیم احمد

''قرآنیات'' میں حسب سابق جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شامل اشاعت ہے۔ یہ قسط سورۂ رعد (۱۳) کی آیات ۱۴-۱۶ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ ان میں یہ واضح کیا گیا کہ جو لوگ خیالی معبودوں پر بھروسا کرتے ہیں وہ خدا کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

''معارف نبوی'' میں ''موطا امام مالک'' کی چند روایات پر مشتمل مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا مضمون ''اللہ کے ذکر کے بغیر کہی ہوئی بات کا ناپسندیدہ ہونا'' شامل کیا گیا ہے۔ اسی کے تحت شاہد رضا صاحب کے مضمون میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت مدینہ کے واقعے کے تناظر میں سیدنا صدیق اکبر کی خصوصی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے۔

''مقامات'' میں جناب جاوید احمد غامدی کا مضمون ''ریاست اور حکومت'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ''اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ'' پر تنقیدات کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

''سیر و سوانح'' کے تحت محمد وسیم اختر مفتی صاحب نے اپنے مضمون ''حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ'' کے آخری حصے میں حضرت عمار بن یاسر کی شہادت اور آپ کی تعریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات کا ذکر کیا ہے۔

''مقالات'' میں شبلی نعمانی صاحب کے مضمون ''سر سید مرحوم اور اردو لٹریچر'' میں اردو لٹریچر کے لیے سر سید احمد خان مرحوم کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔

''نقد و نظر'' میں ''جوابی بیانیوں کا پس و پیش'' کے عنوان سے ساجد حمید صاحب کا مضمون شامل اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے ''اسلام اور ریاست — ایک جوابی بیانیہ'' پر تنقیدات کے سلسلے میں اپنا موقف بیان کیا ہے۔

''یسئلون'' میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ''حکومت اسلامی کے قیام کی شرط اول'' شائع کیا گیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی، بہر حال وہ ایک بالغ معاشرہ ہی سے وجود میں آتی ہے۔

''وفیات'' میں ''مولانا ابوالکلام آزاد'' کے زیر عنوان مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا پر کی جانے والی تنقید کا جواب دیا اور دین کے لیے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔

''ادبیات'' میں جاوید احمد غامدی صاحب کی ایک غزل شائع کی گئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الرعد

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ

اُسی کو پکارنا برحق ہے۔ اُس کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں، وہ اِس سے زیادہ اِن کی دادرسی نہیں کر سکتے کہ کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے کہ وہ اُس کے منہ تک پہنچ جائے، درآں حالیکہ وہ کسی طرح اُس کے منہ تک پہنچنے والا نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن منکروں کی فریاد محض صدا بہ صحرا ہے۔ ۱۴

زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب طوعاً و کرہاً خدا ہی کو سجدہ کر رہے ہیں اور صبح و شام اُن کے سایے بھی۔[۱۴۶] اِن سے پوچھو، زمین اور آسمانوں کا مالک کون ہے؟ کہہ دو، اللہ۔ اِن سے پوچھو، کیا پھر

۱۴۶؎ یہ استدلال کی ایک خاص قسم ہے جسے اشارات سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اِس میں ذہن کو علامت سے حقیقت

اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ
اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ
الْخَلْقُ عَلَیْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

بھی تم نے اُس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ اِن سے پوچھو، کیا اندھے اور آنکھوں والے، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یا اندھیرے اور روشنی، دونوں برابر ہوں گے؟[۱۴۷] (اگر ایسا نہیں تو) کیا اُنھوں نے خدا کے ایسے شریک ٹھیرائے ہیں جنھوں نے اُسی طرح پیدا کیا ہے، جس طرح خدا نے پیدا کیا ہے، سو اُن پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے[۱۴۸]؟ اِنھیں بتا دو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب ہے۔۱۵-۱۶

کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی مخاطب کو ہر چیز کے مطیع و منقاد اور قانون سے مسخر ہونے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے کہ دیکھ لو، چیزوں کے سایے بھی رات بھر سجدے میں پڑے رہتے ہیں، صبح کو آہستہ آہستہ سر اٹھاتے اور زوال آفتاب کے بعد ایک مرتبہ پھر اُسی پروردگار کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

۱۴۷؎ یعنی خدا کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کی بات مان کر وہ عقلی اور اخلاقی لحاظ سے اندھوں اور بیناؤں کو ایک ہی انجام سے دوچار کر دے گا؟ آیت میں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ اندھیرے کے لیے 'ظُلُمٰت' کا لفظ جمع لائے ہیں، جبکہ اُس کے مقابل لفظ 'نُوْر' واحد استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ لطیف اشارہ مقصود ہے کہ تاریکیاں ہزار راستوں سے ظہور میں آتی ہیں، مگر روشنی اور اجالے کا منبع ایک ہی ہے اور وہ اِس کائنات کا پروردگار ہے۔

۱۴۸؎ چنانچہ مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی درجے میں دوسروں کو بھی خالق مان کر خدائی میں شریک ٹھیرائیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی
ترتیب وتدوین: خالد مسعود-سعید احمد

اللہ کے ذکر کے بغیر کہی ہوئی بات کا ناپسندیدہ ہونا

(مَا يُكْرَهُ مِنَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ ابْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ: قَدِمَ رَجُلَانِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَخَطَبَا فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا أَوْ قَالَ: إِنَّ بَعْضَ الْبَيَانِ لَسِحْرٌ.

’’عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ دو آدمی مشرق سے آئے تو انھوں نے اپنی بات اس خوبی سے کہی کہ سب لوگ اَش اَش کر اٹھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلام میں جادو ہوتا ہے یا یوں فرمایا کہ بعض کلام جادو ہوتا ہے۔‘‘

وضاحت

عرب کے مشرق میں عراق اور ایران ہیں۔ یہ دونوں شخص انھی علاقوں کے رہے ہوں گے، لیکن تھے یہ دونوں بڑے خطیب اور انھوں نے سامعین کو بے حد متاثر کیا۔ بلاشبہ، خطابت بڑا فن ہے اور اس میں سحر ہوتا ہے جو سامعین کو مسحور کر لیتا ہے۔

حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ كَانَ یَقُوْلُ: لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَیْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَتَقْسُوَ قُلُوْبُكُمْ فَإِنَّ الْقَلْبَ الْقَاسِیَ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ لَا تَعْلَمُوْنَ وَلَا تَنْظُرُوْا فِیْ ذُنُوْبِ النَّاسِ كَأَنَّكُمْ أَرْبَابٌ وَانْظُرُوْا فِیْ ذُنُوْبِكُمْ كَأَنَّكُمْ عَبِیْدٌ فَإِنَّمَا النَّاسُ مُبْتَلًی وَ مُعَافًی فَارْحَمُوْا أَهْلَ الْبَلَاءِ وَاحْمَدُوا اللّٰهَ عَلَی الْعَافِیَةِ.

”امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ عیسیٰ ابن مریم فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ باتیں نہ کیا کرو، ورنہ تمھارے دل سخت ہو جائیں گے، اور سخت دل اللہ سے بہت دور ہوتا ہے، لیکن تم جانتے نہیں۔ اور لوگوں کے گناہوں پر آقاؤں کے طریقے پر نگاہ نہ ڈالو، بلکہ اپنے گناہوں پر غلاموں کے طریقے سے نگاہ رکھو۔ ہر شخص ابتلا میں ڈالا جاتا ہے اور معافی بھی ملتی ہے۔ تو جو لوگ ابتلا میں ڈالے جائیں، ان پر رحم کرو۔ اور اللہ کا شکر کیا کرو جب عافیت نصیب ہوئی ہو۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وضاحت

اگرچہ حضرت عیسیٰ کا یہ قول انجیلوں میں موجود نہیں، لیکن بات بالکل ٹھیک ہے کہ زیادہ کلام سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی بھی کہا کرتے تھے کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ زیادہ تقریر کرتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کو بے حد سنگ دل پایا۔

حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ تُرْسِلُ اِلٰی بَعْضِ أَهْلِهَا بَعْدَ الْعَتَمَةِ فَتَقُوْلُ: أَلَا تُرِیْحُوْنَ الْكُتَّابَ.

”مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے کچھ عزیزوں کے پاس عشاء کے بعد اپنا آدمی بھیجتیں اور کہتیں: ابھی کراماً کاتبین کو آرام نہیں کرنے دو گے!“

وضاحت

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کے یہ عزیز عشاء کے بعد باتوں میں مصروف رہتے تھے۔ بالآخر ام المومنین کو یہ

پیغام بھیجنا پڑتا کہ یہ بکواس کب تک جاری رہے گی۔ خدا کے بندو، اب تو کراماً کاتبین کو آرام کرنے کا موقع دو۔

ہمارے معاشرہ میں بھی یہ حال ہے کہ ۹ بجے شب کے بعد اصلی زندگی شروع ہوتی ہے۔ رات کو بیگمات، صاحبزادیاں اور شہزادگان اپنے تمام کھلونوں کے ساتھ کھیل میں لگ جاتے یا بازار کا رخ کرتے ہیں کہ ان کے لیے باہر نکلنے کا وقت یہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بستر پر لیٹنے کا وقت بارہ ایک بجے شب ملتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فجر کے وقت ان کے بیدار ہونے کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس حیوانی زندگی میں اللہ کی یاد کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔

(تدبر حدیث ۵۰۵-۵۰۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شاہد رضا

سیدنا صدیق اکبر: خصوصی فضیلت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معیت خداوندی و نبوی

حَدَّثَنَاهُ أَحْمَدُ بْنُ يُوسُفَ، ثَنَا الْحَارِثُ بْنُ أَبِي أُسَامَةَ، وَحَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ جَعْفَرِ بْنِ حَمْدَانَ الْبَصْرِيُّ، ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَحْمَدَ الدَّوْرَقِيُّ، قَالَا: حَدَّثَنَا عَفَّانُ بْنُ مُسْلِمٍ، ثَنَا هَمَّامٌ، ثَنَا ثَابِتٌ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ حَدَّثَهُ، قَالَ: قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ـــ وَنَحْنُ فِي الْغَارِ ـــ لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ يَنْظُرُ إِلَى قَدَمَيْهِ لَأَبْصَرَنَا تَحْتَ قَدَمَيْهِ، فَقَالَ: يَا أَبَا بَكْرٍ، مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا.

...حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے مجھے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ـــ جبکہ ہم دونوں غار (ثور) میں تھے ـــ عرض کیا: اگر ان (مشرکین مکہ) میں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف دیکھے گا تو وہ اپنے قدموں کے نیچے ہمیں دیکھ لے گا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اے ابوبکر، تمھارا ان دو

شخصیتوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہے[1]۔

توضیح حدیث

'نَحۡنُ فِي الۡغَارِ' (ہم دونوں غار میں تھے)۔ اس میں غار سے مراد جبل ثور کی ایک غار ہے جو کہ مکۂ مکرمہ کی دائیں جانب ساڑھے چار کلومیٹر کی مسافت پر جنوب میں واقع ہے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول 'لَوۡ أَنَّ أَحَدَهُمۡ يَنۡظُرُ إِلٰى قَدَمَيۡهِ لَأَبۡصَرَنَا تَحۡتَ قَدَمَيۡهِ' سے مراد یہ ہے کہ غار کے دہانے کے اوپر ہونے کی وجہ سے اگر مشرکین مکہ نے نیچے دیکھ لیا تو وہ بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے صاحب ابوبکر اسی غار میں پناہ گیر ہیں، جیسا کہ ایک اور روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیدنا ابوبکر نے فرمایا کہ میں نے جب اپنا سر اٹھایا تو مشرکین مکہ کو غار کے اوپر دیکھا، یعنی وہ ہمارے سروں کے اوپر تھے[2]۔

'إِثۡنَيۡنِ' (دو) سے مراد نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

'أَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا' (ان دو کے ساتھ تیسرا اللہ ہے)۔ اس کی تقدیر کلام 'أَللّٰهُ ثَالِثُ كُلِّ اثۡنَيۡنِ' ہے اور 'ثَالِثُهُمَا' کا مفہوم 'نَاصِرُهُمَا وَ مُعِينُهُمَا'[3] (اللہ تعالیٰ ان دونوں کا مددگار اور اعانت کرنے والا ہے) ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و علم، نصرت و حمایت اور اعانت کے ذریعے سے ہم دونوں کے ساتھ ہے، اسی طرح وہ ان مشرکین اور اعدائے اسلام سے ہماری عصمت و حفاظت کا اہتمام بھی فرمائے گا۔

مذکورہ ارشاد مبارک میں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معیت کو لازم کیا ہے، اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق کے لیے بھی لازم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں 'اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا' میں اس معیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس معیت سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا استثنا کرنا یا سمجھنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، کیونکہ 'اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا' (اللہ ہمارے ساتھ ہے) فرمایا ہے، نہ کہ 'اِنَّ اللّٰهَ مَعِيۡ' (اللہ میرے ساتھ ہے)۔ مزید برآں اس سے عارضی معیت بھی مراد نہیں لی جا سکتی کہ صرف اسی حالت میں اور اسی غار میں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، بلکہ 'ما ظنك باثنين اللّٰه ثالثهما' سے ابدی معیت مراد ہے، یعنی تمھارا ان دو شخصیتوں کے بارے میں

---

[1] فضائل الخلفاء الاربعۃ، ابونعیم اصفہانی، رقم ۱۔

[2] بخاری، رقم ۳۹۲۲۔

[3] فتح الباری ۷/۱۱۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کیا خیال ہے جن کے ساتھ ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہے۔

معیت الٰہی کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ **معیت عامہ:** اس سے مراد معیت علم، احاطہ اور احصا ہے۔ اس میں مومن اور کافر، دونوں شامل ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ'[۴] (اور تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے)۔

۲۔ **معیت خاصہ:** اس سے مراد معیت نصرت و تائید ہے۔ یہ معیت اللہ تعالیٰ اپنے انبیا و رسل اور ان کے مومن ساتھیوں کو عطا کرتا ہے، اور یہ معیت وہ صرف خشیت الٰہی، ایمان اور اسلام کے ذریعے سے ہی حاصل کر سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'کَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ'[۵] (اہل ایمان کی نصرت ہم پر لازم تھی) اور 'لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'[۶] (غم نہ کریں، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے)۔ اوپر حدیث میں بھی اسی معیت کی طرف اشارہ ہے۔[۷]

اللہ تعالیٰ کا آیت غار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد 'لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا' نقل کرنا ہی سیدنا صدیق اکبر کے لیے اثبات معیت کے لیے واضح دلیل ہے، اور اس بات کو مؤکد فرما دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کے سبب سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی معیت الٰہیہ حاصل ہوئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

موقع و محل

یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کی طرف سفر ہجرت سے متعلق ہے، جبکہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہم رکاب تھے۔ کتب احادیث اور سیر و تاریخ میں آتا ہے کہ دعوت اسلام کو ختم کرنے کے لیے جب صنادید قریش نے دار الندوہ میں اپنے شیخ نجدی ـــــ ابلیس ـــــ کی اقتدا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے مجلس شوریٰ منعقد کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں آگاہ فرما دیا، اور آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم فرمایا۔

۴؎ الحدید ۵۷:۴۔

۵؎ الروم ۳۰:۴۷۔

۶؎ التوبہ ۹:۴۰۔

۷؎ ملخصاً، شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ، لالکائی ۱۸/ ۱۴۔

چنانچہ قریش مکہ نے اپنے اتحادی قبائل کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر کے وہ بھی مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ ۲۷ر صفر ۱۴ نبوی بہ مطابق ۱۲-۱۳ر ستمبر ۶۲۲ء کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندھیرے میں منکرین مکہ کے پاس سے بہ حفاظت گزر گئے اور ان منکرین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکل جانے کا شعور تک نہ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے سیدنا ابوبکر کے گھر تشریف لے گئے۔ مفسرین اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ ابوبکر کو بھی اس سفر ہجرت میں شامل کر لیں۔ ''تفسیر امام حسن عسکری'' میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

و آمرك أن تستصحب أبا بكر، فإنه إن آنسك و ساعدك و وازرك و ثبت على ما يعاهدك و يعاقدك، كان في الجنة من رفقائك و في غرفاتها من خلصائك. (۳۱۴)

''اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے کہ ابوبکر کو اپنے ساتھ لیں، کیونکہ اگر انھوں نے آپ سے محبت کی، آپ کی مدد کی، آپ سے ہمدردی کی اور آپ سے کیے ہوئے عہد اور اقرار پر ثابت قدم رہے تو وہ جنت میں آپ کے رفقا میں سے اور اس کے حجروں میں آپ کے خاص مصاحبوں میں سے ہوں گے۔''

علامہ باقر مجلسی نے ''حیاۃ القلوب'' میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مصاحبت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

و ترا امر کرده است که ابوبکر را همراه خود ببری. (۳۱۰/۲)

''اور (اللہ تعالیٰ نے) آپ کو حکم دیا ہے کہ ابوبکر کو اپنے ہمراہ لے جائیے۔''

علامہ قاضی نور اللہ شوستری نے ''مجالس المومنین'' میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مصاحبت کے حوالے سے حکم خداوندی کو ایک فیصلہ کن بات میں بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

و بهمه حال رفتنِ محمد صلی اللّٰه علیه وسلم وبردنِ ابوبکر بے فرمانِ خدا نه بود. (۲۰۳)

''بہر حال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا (ہجرت کے لیے) روانہ ہونا اور ابوبکر کو اپنے ساتھ لے جانا، یہ خدا کے فرمان کے بغیر نہ تھا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کو ان کے گھر سے اپنے ساتھ لیا اور مدینہ کی طرف رخت سفر باندھا۔ مستند روایات میں آتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیابان کا کچھ فاصلہ طے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک زخمی ہو گئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منکرین مکہ کے تعاقب کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبل ثور کی ایک غار میں پناہ لے لی اور دو کبوتروں نے اس غار کے دہانے پر انڈے دے دیے۔ جب کفار مکہ غار کے قریب پہنچ گئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی گفتگو سن کر خوف زدہ ہو گئے،[8] جس پر ان کی تسلی کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام مجید کے بے مثل الفاظ 'لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا' صادر ہوئے۔

دریں اثنا، حضرت ابوبکر کے حکم کے مطابق آپ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ مشرکین مکہ کی دن بھر کی خبر مہیا کرتے اور آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہ آپ کے لیے رات کے وقت اپنی بکریاں لے جا کر دودھ کا انتظام کرتے۔ آپ کی بیٹی حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لیے کھانا لے کر آتیں۔ اصح قول کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غار میں تین دن اور تین راتیں گزاریں۔ قرآن مجید نے اس سفر ہجرت کو بالاجمال ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِلَّا تَنۡصُرُوۡہُ فَقَدۡ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذۡ اَخۡرَجَہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ثَانِیَ اثۡنَیۡنِ اِذۡ ہُمَا فِی الۡغَارِ اِذۡ یَقُوۡلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلَیۡہِ وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡہَا وَجَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا السُّفۡلٰی وَکَلِمَۃُ اللّٰہِ ہِیَ الۡعُلۡیَا وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ. (التوبہ ۹: ۴۰)

''اگر تم پیغمبر کی مدد نہیں کرو گے (تو کچھ پروا نہیں)، اِس لیے کہ اُس کی مدد تو اللہ نے اُس وقت فرمائی، جب اِنھی منکروں نے اُس کو اس طرح نکالا تھا کہ وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اللہ نے اُس وقت اُس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکروں سے اُس کی مدد کی جو تم کو نظر نہیں آئے اور منکروں کی بات اُس نے نیچی کر دی اور خدا کی بات ہی اونچی رہی۔ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔''

عبداللہ بن اریقط، جو کہ صحرائی اور بیابانی راستوں کا ماہر تھا اور اپنے ہی دین پر ہونے کے باوجود قابل اعتماد تھا،

۸۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ اضطراب اپنی ذات کے لیے نہیں تھا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا تو یہ دین معدوم ہو جائے گا اور یہ امت ہدایت سے محروم ہو جائے گی، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اگر میں قتل کر دیا گیا تو کوئی پروا نہیں، کیونکہ میں محض ایک آدمی ہوں، لیکن اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا تو امت غارت ہو جائے گی (فتح البیان فی مقاصد القرآن، قنوجی ۵/۳۰۵)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے سفر مدینہ کے لیے اجرت طے ہو چکی تھی، وہ وقت مقرر پر تین راتیں گزر جانے کے بعد غار ثور پر سواریاں لے کر آ گیا۔ اس طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو اہل مدینہ نے نہایت ہی والہانہ انداز میں آپ کا استقبال کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفیق مخلص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سوموار ۸/ ربیع الاول ۱۴ نبوی، یعنی یکم ہجری بہ مطابق ۲۳/ ستمبر ۶۲۲ء کو قباء میں وارد ہوئے۔

سند حدیث

اتصال کے اعتبار سے یہ حدیث مرفوع ہے اور ردوقبول کے اعتبار سے حسن ہے۔

تخریج حدیث

اپنی اصل کے اعتبار سے یہ حدیث حافظ ابونعیم اصبہانی نے ''فضائل الخلفاء الاربعۃ''، رقم ۱ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے روایت کی ہے، جبکہ رقم ۲ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے روایت کی ہے۔ دیگر مصادر ومراجع میں یہ حدیث ان درج ذیل مقامات میں روایت کی گئی ہے:

بخاری، رقم ۳۶۵۳، ۳۹۲۲، ۴۶۶۳؛ مسلم، رقم ۲۳۸۱، ۶۳۱۹؛ ترمذی، رقم ۳۰۹۶؛ ابن حبان، رقم ۶۲۷۸، ۶۸۶۹؛ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۱۹۲۹، ۳۶۶۱۳؛ مسند ابویعلیٰ، رقم ۶۶-۶۷؛ احمد، رقم ۱۱-۱۲؛ مسند بزار، رقم ۳۶، مسند الصحابہ، رقم ۷؛ مسند عبد بن حمید، رقم ۲؛ مسند ابوبکر صدیق، مروزی، رقم ۷۱-۷۲، ۷۴؛ کنز العمال، رقم ۳۱۵۶۸، ۳۲۶۱۴؛ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۳: ۱۷۴؛ معجم ابن الاعرابی، رقم ۲۰۶۷؛ معجم ابن المقری، رقم ۳۳۳، ۵۹۵؛ معجم ابن عساکر، رقم ۱۷۱؛ شرح مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۴۰۸۱؛ الاربعون الابدال العوالی، ابن عساکر، رقم ۳۰؛ الاربعین فی صفات رب العٰلمین، ذہبی، رقم ۴۳؛ الاربعین، ابوسعد نیشاپوری، رقم ۱؛ امالی الزجاج ۱: ۱۸۳؛ الجامع المسند، بجیری ۵۹؛ جامع الاصول، ابن اثیر، رقم ۹۲۰۵؛ دلائل النبوۃ، ابونعیم اصبہانی، رقم ۲۳۱؛ دلائل النبوۃ، بیہقی ۲: ۴۸۱؛ الدرر فی اختصار المغازی والسیر، ابن عبدالبر ۱: ۸۱؛ عوالی الحارث، رقم ۵۰؛ فوائد تمام، رازی، رقم ۸۰۵؛ تلخیص المتشابہ فی الرسم، خطیب بغدادی ۱/ ۴۶۶؛ السنۃ، ابن ابی عاصم رقم ۱۲۲۵؛ الشریعۃ، آجری، رقم ۱۲۷۹-۱۲۸۱؛ شرح مذاہب اہل السنۃ، ابن شاہین، رقم ۶۷؛ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ، لالکائی ۱۸/ ۱۴؛ شرح السنۃ، بغوی، رقم ۳۷۶۴؛ الانوار فی شمائل النبی المختار، بغوی، رقم ۵۶؛ اخبار مکۃ، فاکہی، رقم ۲۳۴۸، ۲۴۱۳؛ اخبار اصبہان، رقم ۵۰۹؛ انساب الاشراف، بلاذری ۱۰/ ۶۱۔

معروف مؤرخ علامہ میر خواند نے اپنی کتاب ''روضۃ الصفا'' میں اس روایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آورده اند که مشرکان در جستجوی محمد بجائی رسیدند که از ایشان تا حضرت چهل کز مسافت پیش نبود و قایف کفت: والله که مطلوب شما از اینجا نکذشته، ابوبکر این سخن شنیده بترسید و غمناك شد، حضرت فرمود که 'لاتحزن إن الله معنا'، ابوبکر کفت: یارسول الله، مشرکان اکر در پیش پای خویش نظر کنند ما را به بینند، رسولؐ فرمود: که ظن تو بدو شخص که خدا تعالیٰ سیم ایشان است چیست؟ (۶۷/۲)

”روایتوں میں آتا ہے کہ مشرکین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں اس (غار کی) جگہ اتنے قریب پہنچ گئے کہ ان کے اور حضرت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان چالیس گز سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہو گا اور قیافہ شناس نے کہا: اللہ کی قسم، تمھارا مطلوب اس جگہ سے آگے نہیں گیا، حضرت ابوبکر یہ گفتگو سن کر خوف زدہ اور غم ناک ہو گئے، حضرت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: غم نہ کریں، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، حضرت ابوبکر نے عرض کیا: یارسول اللہ، مشرکین اگر اپنے پاؤں کے سامنے دیکھیں گے تو وہ ہمیں دیکھ لیں گے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارا ان دو شخصیتوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہے؟“

امیر جلال الدین محدث شیرازی نے بھی اس حدیث کو اپنی تاریخ کی کتاب ”روضۃ الاحباب“ میں بعینہٖ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

چون نزدیک رسیدند بغار قایف کفت: مطلوب شما ازین غار تجاوز نکرده و دران حالت ابوبکرؓ بعرض حضرت رسانید که یارسول الله، اکر چنانچه یکی ازیشان در شیب هر دو قدم خود نکاه کند هر آینه ما را به بیند، خواجهٔ کائنات فرمود: ما ظنک باثنین الله ثالثهما. (۱۰۰)

”جب وہ (مشرکین) غار کے نزدیک پہنچ گئے تو قیافہ شناس نے کہا: تمھارا مطلوب اس غار سے آگے نہیں گیا۔ اس حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: یارسول اللہ، اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کی طرف نیچے دیکھا تو وہ ہمیں یقیناً دیکھ لے گا، سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تمھارا ان دو شخصیتوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہے۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

ریاست اور حکومت

[''اسلام اور ریاست ـــــ ایک جوابی بیانیہ'' پر تنقیدات کے جواب میں لکھا گیا۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ریاست اور حکومت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ علم سیاست کی اصطلاح میں ریاست معاشرے کی سیاسی تنظیم ہے اور حکومت کا لفظ اُن ارباب حل وعقد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو اُس میں نظم ونسق قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں۔

پہلے ریاست کو لیجیے۔ اِس کی جو اقسام اب تک دنیا میں نمایاں ہوئی ہیں، وہ اصلاً تین ہی ہیں:

ایک، جزیرہ نماے عرب کی ریاست جس کے حدود خود خالق کائنات نے متعین کر کے اُس کو اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔ چنانچہ اُسی کے حکم پر اُس کی دعوت اور عبادت کا عالمی مرکز اُس میں قائم کیا گیا اور ساتویں صدی عیسوی میں آخری رسول کی وساطت سے اعلان کر دیا گیا کہ 'لا یجتمع فیھا دینان' ''اب قیامت تک کوئی غیر مسلم اِس کا شہری نہیں بن سکتا۔'' اِس سے پہلے کئی صدیوں تک یہی حیثیت ریاست فلسطین کی تھی۔ اسلام اور اسلامی شریعت کے مخاطب یہاں بھی اپنی مختلف حیثیتوں میں افراد ہی ہوں گے، تاہم اِس طرح کی ریاست کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اِس کا مذہب اسلام ہے اور اِس میں حکومت بھی اسلام ہی کی ہوگی تو یہ تعبیر ہر لحاظ سے قابل فہم ہے۔ اِس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری، وہ ریاستیں جن کے حدود فاتحین اپنی فتوحات سے متعین کرتے اور اُن کے باشندوں کو محکوم بنا کر اُن پر حکومت کرتے ہیں۔ اِس طرح کی ریاستوں میں شاہی خاندان یا حکمران گروہ کا مذہب اور نظریہ ہی ریاست کا مذہب یا نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ اِس سے قطع نظر کہ اِن کا وجود جائز ہے یا ناجائز، اِن کے متعلق بھی اگر یہ کہا جائے کہ یہ

مسلمان یا مسیحی یا کمیونسٹ ریاستیں ہیں تو اِسے نا قابل فہم قرار نہیں دے سکتے۔

تیسری، دور حاضر کی قومی ریاستیں جن کے حدود بین الاقوامی معاہدات سے متعین ہوتے اور جو وجود میں آتے ہی اپنے باشندوں کے لیے بنائے قومیت بن جاتی ہیں۔ لہٰذا رنگ، نسل، زبان، مذہب اور تہذیب و ثقافت کے اشتراک واختلاف سے قطع نظر وہ اپنے آپ کو ہندی، مصری، امریکی، افغانی اور پاکستانی کہتے اور اپنی قومیت کا اظہار اِسی حوالے سے کرتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی کسی کا حاکم یا محکوم نہیں ہوتا، بلکہ سب ہر لحاظ سے برابر کے شہری سمجھے جاتے ہیں اور اِسی حیثیت سے کاروبار حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔

دور حاضر کی یہی ریاستیں ہیں جن کے بارے میں میں نے لکھا ہے کہ اِن کا کوئی مذہب نہیں ہوسکتا۔ ریاست پاکستان اِسی نوعیت کی ایک ریاست ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اِس کے لیے نہ کوئی فرمان آسمان سے نازل ہوا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کی طرح یہ صرف مسلمانوں کا ملک ہے، نہ مسلمانوں نے اِس کو فتح کر کے اِس میں رہنے والے غیر مسلموں کو اپنا محکوم بنالیا ہے اور نہ وہ اُن کے ساتھ کسی معاہدے کے نتیجے میں اِس ریاست کے شہری بنے ہیں۔ وہ صدیوں سے اِسی سرزمین کے باشندے ہیں، جس طرح مسلمان اِس کے باشندے ہیں اور ریاست جس طرح مسلمانوں کی ہے، اُسی طرح اُن کی بھی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اِس اصول پر نہیں ہوئی تھی کہ ایک حصے کے مالک مسلمان اور دوسرے کے ہندو ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگ اُن کے محکوم بنا دیے گئے ہیں، بلکہ اِس اصول پر ہوئی تھی کہ برطانوی ہند کے جن حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُنھیں الگ ملک بنا دیا جائے گا اور ہندوستان کی ریاستوں کے حکمران آزاد ہوں گے کہ چاہیں تو اپنی آزادی برقرار رکھیں اور چاہیں تو ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی کے ساتھ الحاق کرلیں، اِس سے قطع نظر کہ اُن کی رعایا میں اکثریت مسلمانوں کی ہے یا ہندوؤں کی یا کسی دوسرے مذہبی فرقے کی۔ اِس طرح کی ریاست کو اگر اکثریت کے زور پر مسلمان یا مسیحی یا ہندو بنانے کی کوشش کی جائے گی تو یہ محض تحکم اور استبداد ہوگا، جس کی تائید کوئی ایسا شخص نہیں کرسکتا جس کو اُس کے پروردگار نے حکم دیا ہو کہ وہ ہر حال میں قائم بالقسط رہے گا اور حق کی گواہی دے گا، اگرچہ یہ گواہی اُس کے اپنوں کے خلاف ہی پڑ رہی ہو۔ ریاست پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے حق میں یہ گواہی اب ضروری ہے کہ تاریخ کے صفحات پر ثبت کر دی جائے۔ یہ اُسی حقیقت کی گواہی ہے جو اِس ریاست کے بانی قائد اعظم محمد علی جناح نے ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء کو مجلس دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے پوری صراحت کے ساتھ واضح فرمائی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا:

''اب آپ آزاد ہیں۔ اِس مملکت پاکستان میں آپ آزاد ہیں، آپ مندروں میں جائیں، اپنی مساجد میں جائیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یا کسی اور عبادت گاہ میں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، کاروبار ریاست کا اِس سے کوئی واسطہ نہیں... ہم اِس بنیادی اصول کے ساتھ ابتدا کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک مملکت کے یکساں شہری ہیں۔ انگلستان کے باشندوں کو وقت کے ساتھ ساتھ آنے والے حقائق کا احساس کرنا پڑا اور اُن ذمہ داریوں اور اُس بارگراں سے سبک دوش ہونا پڑا جو اُن کی حکومت نے اُن پر ڈال دیا تھا اور وہ آگ کے اُس مرحلے سے بتدریج گزر گئے۔ آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب وہاں رومن کیتھولک ہیں نہ پروٹسٹنٹ۔ اب جو چیز موجود ہے، وہ یہ کہ ہر فرد ایک شہری ہے اور سب برطانیہ عظمیٰ کے یکساں شہری ہیں۔ سب کے سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اِس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیوں کہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔''

(قائد اعظم: تقاریر و بیانات ۳۵۹/۴)

اِس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اسلام اِس طرح کی ریاست کو قبول کرتا ہے؟ اِس کے جواب میں میں نے یہ عرض کرنے کی جسارت کی ہے کہ اسلام کی دعوت معاشرے کے ارباب حل وعقد کے لیے ہے اور وہ اگر مسلمان ہوں تو نظم اجتماعی سے متعلق اُس کے احکام کے مخاطب بھی وہی ہیں۔ وہ ریاست کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے ہرگز کوئی حکم نہیں دیتا۔ چنانچہ اُس کے ماننے والے اِس طرح کی قومی ریاستوں میں بھی شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر رہ سکتے ہیں، جس طرح کہ اِس وقت دنیا کی بیش تر ریاستوں میں رہ رہے ہیں۔ اِس میں کوئی چیز اسلام اور اسلامی شریعت سے متصادم نہیں ہے۔

دور حاضر کی قومی ریاستوں کے بارے میں یہ میرا موقف ہے۔ اِس کے بعد اب حکومت کو لیجیے۔ علم و عقل کی رو سے اِس کے متعلق دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں: ایک یہ کہ ریاست کے لیے حکمران اور ارباب حل وعقد کا تقرر انسان کا خالق کرے گا۔ دوسرے یہ کہ ریاست کے باشندے کریں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کے بعد پہلی بات کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب دوسری ہی باقی ہے جس کا لازمی نتیجہ اکثریت کی حکومت ہے۔ یہ اکثریت اگر مسلمانوں کی ہے اور اِس کی بنیاد پر اُنھیں کسی ریاست میں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو اُن کا جمہوری اور انسانی حق ہے کہ اُن کے دین نے اگر کوئی حکم اجتماعی زندگی سے متعلق دیا ہے تو وہ خود بھی اُس پر عمل پیرا ہوں اور اُس کے ماننے والوں کے تمام معاملات کا فیصلہ بھی اُسی شریعت کے مطابق کریں جو اُن کے پروردگار نے اپنے آخری پیغمبر کی

وساطت سے نازل فرمائی ہے۔ قائداعظم جب پاکستان کے حوالے سے اسلام، اسلامی تہذیب اوراسلامی شریعت کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کی مراد بھی یہی ہوتی ہے۔

دورحاضر کی قومی ریاستوں کے ساتھ شریعت کا تعلق اِس مقام پر پہنچ کر اور اِس طریقے سے قائم ہوتا ہے۔ میں نے یہی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اِسی کے پیش نظر اجتماعی زندگی سے متعلق اِس شریعت کے احکام کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کر کے پیش کر دی ہے اور لکھا ہے کہ مسلمانوں کو یہ احکام اِس تنبیہ وتہدید کے ساتھ دیے گئے ہیں کہ جولوگ خدا کی کتاب کو مان کر اُس میں خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، قیامت کے دن وہ اُس کے حضور میں ظالم، فاسق اور کافر قرار پائیں گے۔ اہل علم میری مرتب کردہ اِس فہرست سے دلائل کے ساتھ اختلاف کر سکتے اور اس میں ترمیم واضافہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن ریاست اور حکومت کے اِس فرق کو سمجھنے اور اِس فہرست کو دیکھنے کے بعد بھی اگر وہ کہتے ہیں کہ میں نے شریعت کو فردکی انفرادی زندگی تک محدود کر دیا ہے یا سیاست، معیشت، معاشرت اور نظم اجتماعی سے متعلق اُس کے احکام کی نفی کر دی ہے اور اُن کا یہ تجاہل عارفانہ نہیں ہے تو اُن کی خدمت میں پھر اِس کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست

[۲۰۱۵ء]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ

(۴)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت عمار کے قاتل ابوالغادیہ نے حجاج کا زمانہ پایا۔ ایک بار وہ حجاج سے ملنے گئے تو اس نے حضرت عمار کے قاتل ہونے کی بنا پر ان کی خوب مدح سرائی کی، لیکن جب انھوں نے اپنی حاجت بیان کی تو کچھ نہ دیا۔ ابوالغادیہ نے کہا: اسے دیکھو، روز قیامت کی بشارتیں سنا رہا ہے اور دنیا سے کچھ نہیں دیا۔ حجاج بولا: اگر روے زمین پر بسنے والے تمام لوگ مل کر بھی حضرت عمار کو قتل کرتے تو سب کے سب دوزخ میں جاتے۔ ابوالغادیہ کا شمار صحابیوں میں کیا جاتا ہے، کہتے ہیں: میں نے مدینہ میں حضرت عمار کو دیکھا کہ وہ حضرت عثمان کو گالیاں نکال رہے ہیں تو انھیں قتل کی دھمکی دی اور کہا: اللہ نے موقع دیا تو ضرور تمھاری جان لوں گا۔ چنانچہ جنگ صفین میں حضرت عمار نے حملہ کیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت عمار ہیں۔ میں نے ان کی پنڈلیوں اور پھیپھڑوں کے مابین بدن کا حصہ دیکھا جہاں زرہ نہ پہنچتی تھی۔ اسی جگہ وار کر کے ان کو گرا دیا اور قتل کر دیا (احمد، رقم ۱۶۶۴۴)۔

حضرت عمار کی شہادت کی خبر سن کر حضرت علی کو سخت صدمہ ہوا، فرمایا: جس مسلمان پر حضرت عمار کا قتل گراں نہیں گزرا اور مصیبت کا باعث نہیں بنا، بے راہ ہے۔ اللہ نے حضرت عمار پر رحم کیا جب وہ مسلمان ہوئے، جب شہید ہوئے اور وہ ان پر رحم کرے گا جب وہ زندہ اٹھائے جائیں گے۔ حضرت علی فرماتے تھے: میں نے دیکھا ہے کہ حضرت عمار صفین کے جس کنارے یا جس وادی میں جاتے، ان کے ساتھ موجود اصحاب رسول ان کی پیروی کرتے۔ (اپنے آخری حملے میں) وہ ہاشم بن عتبہ کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گئے، ہاشم، آگے بڑھو، جنت تلواروں کے سایے

تلے ہے، موت نیزوں کے اطراف میں ہے، جنت کے دروازے کھل گئے ہیں اور موٹی آنکھوں والی حوریں بن سنور چکی ہیں۔ حضرت عمار کی باندی روایت کرتی ہیں کہ ایک بار حضرت عمار بیمار ہوئے، شدت تکلیف سے نیند جاتی رہی پھران پر غشی طاری ہوگئی۔ ہوش میں آئے تو اہل خانہ کو دیکھا کہ آس پاس رو رہے ہیں، کہا: تمھیں اندیشہ ہے کہ میں بستر ہی پر مر جاؤں گا؟ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی ہے کہ ایک باغی گروہ مجھے قتل کرے گا اور دنیا میں میرا آخری کھانا پانی ملا دودھ ہوگا (دلائل النبوۃ بیہقی: ۴۲۱/۶)۔ حضرت عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا، حضرت عمار کا قاتل اور ان کا مال غنیمت لینے والا، دونوں جہنم میں جائیں گے۔ انھیں کہا گیا: آپ تو ان سے قتال کر رہے تھے۔ حضرت عمرو نے کہا: آپ نے خاص طور پر ان کے قاتل اور مال لینے والے کا نام لیا (احمد، رقم ۱۷۷۰۴)۔

حضرت عمار بن یاسر پہلے مسلمان تھے جنھوں نے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کے لیے الگ جگہ مخصوص کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں 'الطیب المطیب' (پاکیزہ اور خوش گوار) کا لقب عطا کیا تھا۔ حضرت عمار ملنے آئے تو آپ نے 'مرحبًا بالطیب المطیب' کہہ کر فرمایا: ان کو آنے دو (ترمذی، رقم ۳۷۹۸۔ ابن ماجہ، رقم ۱۴۶)۔ آپ کا ارشاد ہے: جنت تین نفوس قدسیہ کو سمونے کی شدت سے منتظر ہے، حضرت علی، حضرت عمار اور حضرت سلمان (ترمذی، رقم ۳۷۹۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۶۶۶)۔ حضرت ابوالدرداء نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد حضرت علقمہ سے پوچھا: کیا تم میں وہ صاحب (حضرت عمار بن یاسر) نہیں رہے جن کے بارے میں اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعے سے خبر دی ہے کہ انھیں شیطان کی دست برد سے محفوظ کر دیا گیا ہے (بخاری، رقم ۳۲۸۸۔ ترمذی، رقم ۳۸۱۱)۔ حضرت قیس بن عباد نے حضرت عمار بن یاسر سے پوچھا: حضرت علی کے نزاعات میں آپ کا جو برتاؤ رہا، کیا یہ رائے تھی جو آپ نے خود اختیار کی یا کوئی ہدایت تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو تلقین ہوئی۔ حضرت عمار نے جواب دیا: ہمیں وہی ہدایات ملیں جو آپ نے تمام بنی نوع انسان کو دیں، ان سے الگ کوئی رہنمائی ہمیں نہیں ملی (مسلم، رقم ۷۱۳۶۔ احمد، رقم ۱۸۲۲۹)۔ یہی بات حضرت علی نے ان الفاظ میں کہی: اس خالق کی قسم جس نے بیج کو شق کر کے درخت پیدا کیا اور جان دار مخلوق تخلیق کی، مجھے اس فہم کے علاوہ کوئی رہنمائی نہیں ملی جو اللہ ایک بندے کو قرآن میں دیتا ہے یا جو اس صحیفے میں درج ہے۔ سائل نے پوچھا: اس کتابچے میں کیا ہے؟ بتایا: اس میں دیت اور غلام آزاد کرنے کے احکام ہیں، یہ حکم ہے کہ کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے اور یہ کہ کوہ ثبیر سے کوہ ثور تک حرم مدینہ ہے۔ حضرت حذیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان روایت کرتے ہیں کہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میرے بعد ابوبکر وعمر کی پیروی کرنا اور عمار کے طریقے پر چلنا اور جو ابن مسعود کہیں، اس کی تصدیق کرنا (ترمذی، رقم ۳۷۹۹۔ احمد، رقم ۲۳۲۷۹)۔ حضرت ابومسعود کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ نے یہ بات اپنے آخری وقت کہی۔ انھوں نے اس پر یہ اضافہ بھی کیا، ابن سمیہ کے طریقے کو پکڑے رکھنا، کیونکہ وہ اپنی وفات تک حق کو نہ چھوڑیں گے۔ حضرت حذیفہ ہی سے روایت ہے کہ ابوالیقظان فطرت پر رہیں گے، اسے نہ چھوڑیں گے، حتیٰ کہ ان کی وفات ہو جائے یا بڑھاپا عقل زائل کر دے۔ حضرت عمار کو دو چیزوں میں سے ایک کو ترجیح دینے کو کہا گیا تو انھوں نے بہتر انجام کار کا باعث بننے والی شے ہی اختیار کی (ترمذی، رقم ۳۷۹۹۔ ابن ماجہ، رقم ۱۴۸)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: ''جب لوگوں کا باہمی اختلاف ہوگا تو عمار بن یاسر حق کا ساتھ دیں گے (بیہقی ۶/ ۴۲۲، بہ سند ضعیف)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمار پاؤں سے کانوں کی لوؤں (یا مونڈھوں) تک ایمان سے بھرپور ہیں۔'' (نسائی، رقم ۵۰۰۷۔ ابن ماجہ، رقم ۱۴۷)۔ حضرت خالد بن ولید فرماتے ہیں: میرے اور حضرت عمار کے درمیان کوئی نزاع ہوا تو میں نے سخت جملے کہہ ڈالے تو حضرت عمار سخت ناراض ہو گئے۔ پھر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے سر بلند کر کے فرمایا: خالد، عمار کا دل نہ دکھاؤ، جو عمار سے بغض رکھتا ہے، اللہ اسے اچھا نہیں سمجھتا اور جو عمار سے دشمنی رکھتا ہے، اللہ اس سے دشمنی رکھتا ہے (احمد، رقم ۱۶۷۵۸۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۶۶۷)۔ حضرت خالد کہتے ہیں کہ اس فرمان نبوی کے بعد مجھے اس کے علاوہ کسی شے میں دل چسپی نہ تھی کہ میں حضرت عمار کو راضی کر لوں۔ چنانچہ میں ان سے ملا تو ان کی ناراضی ختم ہوگئی۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں: کوئی صحابی ایسا نہ تھا کہ میں نے اس کے بارے میں جو جی میں آیا، کہہ دیا سوائے حضرت عمار بن یاسر کے، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ''عمار کانوں کی لوؤں سے پاؤں کے تلووں تک ایمان سے سرشار ہیں۔'' حضرت عمرو بن عاص سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو پسند کرتے تھے اور عامل مقرر فرماتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: میں نہیں جانتا، وہ محبت تھی یا مجھ سے استعانت لی گئی تھی، تاہم میں دو آدمیوں کے بارے میں گواہی دے سکتا ہوں کہ آپ ان سے محبت فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمار بن یاسر (احمد، رقم ۱۷۷۳۴)۔ لوگوں نے کہا: حضرت عمار کو تو آپ نے صفین میں قتل کر دیا۔ حضرت عمرو نے جواب دیا: تم سچ کہتے ہو۔ حضرت علی سے مروی ہے: مجھ سے پہلے ہر نبی کو سات معزز رفقا وزیر بنا کر دیے گئے تھے، جبکہ مجھے چودہ نقیبوں کی معیت حاصل ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت حمزہ، حضرت جعفر، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت مقداد، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت سلمان، حضرت عمار، حضرت بلال اور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت ابوذر (احمد، رقم ۱۲۶۲)۔

حضرت عمار کم گو تھے۔ اکثر دعا کرتے کہ میں فتنوں میں پڑنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ جنگ صفین کے لیے جاتے ہوئے کنار فرات کھڑے ہو کر یہ دعا مانگی: اے اللہ، اگر مجھے علم ہوتا کہ اس پہاڑ سے گر کر اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو تو راضی ہو جائے گا تو میں چھلانگ لگا دیتا۔ اگر پتا ہوتا کہ شدید آگ بھڑکا کر اس میں بھسم ہو جانے سے تو خوش ہو جائے گا تو کر گزرتا۔ اگر معلوم ہو جاتا کہ دریا میں ڈوب مرنے سے تیری رضا حاصل ہو جائے گی تو میں ڈوب جاتا۔ میں تیری خوشنودی ہی کے لیے جنگ کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تو مجھے رسوا نہ کرے گا۔ ایک شخص نے حضرت عمر کے آگے حضرت عمار کی چغلی لگائی تو اس طرح بد دعا دی: اللہ، اگر اس نے مجھ پر بہتان باندھا ہے تو اس کو دنیا میں وسعت دے اور پوتوں پڑپوتوں والا بنا دے۔ ایک شخص نے حضرت عمار کا کپڑوں کا تھیلا چوری کر لیا۔ انھوں نے چور کو جا پکڑا، اپنی زنبیل لی اور اسے چھوڑ دیا۔ حضرت عمار جب کوفہ کے گورنر تھے، جانوروں کا چارہ خود خریدتے اور کمر پر لاد کر گھر لے جاتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود گھر تعمیر کر رہے تھے۔ حضرت عمار پاس سے گزرے تو پوچھا: ابوالیقظان، آپ کو گھر کیسا لگا؟ کہا: تو نے مضبوط گھر بنایا ہے اور لمبی امیدیں رکھی ہیں، حالاں کہ جلد ہی مر جائے گا۔

حضرت عمار طویل القامت، چوڑے شانوں والے تھے، رنگ گندمی تھا، سیاہ آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ حضرت عمار کی پیشانی پر تھوڑے بال تھے، خضاب کا استعمال نہ کرتے تھے۔ حضرت عمار کے بیٹے محمد عالم حدیث تھے۔ ام الحکم ان کی بیٹی تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عمار بن یاسر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حذیفہ بن یمان سے بیس سے زیادہ احادیث روایت کیں۔ ان میں سے پانچ بخاری و مسلم میں ہیں۔ حضرت عمار سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں: حضرت علی بن ابوطالب، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت ابوامامہ باہلی، حضرت ابوطفیل، حضرت محمد بن عمار (بیٹے)، حضرت سعید بن مسیّب، حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن، حضرت حجر بن عدی، حضرت ابولاس خزاعی، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت ابووائل شقیق، حضرت علقمہ، حضرت زر بن حبیش، حضرت ثروان، حضرت حبیب بن صہبان، حضرت حسان بن بلال، حضرت حسن بصری، حضرت خلاس بن عمرو، حضرت ریاح بن حارث، حضرت سائب، حضرت سلمہ بن محمد (پوتے)، حضرت عبداللہ بن سلمہ، حضرت عبداللہ بن ابوہذیل، حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی، حضرت علقمہ بن قیس، حضرت محمد بن علی، حضرت میمون بن ابوشیب، حضرت نعیم بن حنظلہ، حضرت ہمام بن حارث اور حضرت ابومریم اسدی۔

حضرت عمار بن یاسر سے تفسیری روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ جیسے سورۂ مائدہ کی وہ تفسیری روایت جس کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں پر آسمان سے گوشت، پھلوں اور روٹیوں سے بھرا ہوا دستر خوان (مائدہ) نازل ہوا۔ مجاہد اور حسن بصری کہتے ہیں کہ ایسا کوئی مائدہ نازل نہ ہوا۔ حضرت عمار نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تیمّم کرنے کا صحیح طریقہ سیکھا، جبکہ کئی اصحاب کو اس کا علم بعد میں ہوا (بخاری، رقم ۳۳۸)۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت ابن مسعود سے مسئلہ پوچھا کہ اگر غسل جنابت کی حاجت رکھنے والے شخص کو پانی نہ ملے تو کیا کرے؟ تو انھوں نے جواب دیا: وہ پانی نہ ملنے تک نماز ہی نہ پڑھے۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا: پھر حضرت عمار بن یاسر کے بیان کا کیا جائے کہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنبی کے لیے تیمّم کافی قرار دیا تھا اور قرآن مجید کی اس آیت 'فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا'، ''تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کر لو'' (المائدہ ۵: ۶) پر کیسے عمل کیا جائے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود کوئی جواب نہ دے سکے۔ صرف اتنا کہا: اگر ہم نے یہ رخصت دے دی تو ہو سکتا ہے، کوئی محض پانی ٹھنڈا لگنے پر تیمّم کی سہولت استعمال کرنے لگے (بخاری، رقم ۳۴۶۔ ابوداؤد، رقم ۳۲۱)۔ حضرت عمر نے تیمّم کا مسئلہ بیان کرنے پر حضرت عمار کو ڈانٹا کہ اللہ سے ڈرو تو انھوں نے کہا: اگر آپ چاہیں تو میں یہ روایت بیان نہ کروں (مسلم، رقم ۷۴۸)۔ تب انھوں نے حضرت عمار کو نہ روکا۔ حضرت عمر کے قائل نہ ہونے کا حضرت ابن مسعود نے بھی حوالہ دیا (بخاری، رقم ۳۴۵)۔ حضرت ابوبکر نماز کے اندر پست آواز میں، جبکہ حضرت عمر بلند آواز سے قراءت کرتے اور حضرت عمار مختلف سورتوں کو ملا کر تلاوت کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتائی گئی تو آپ نے تینوں سے سبب پوچھا۔ حضرت ابوبکر نے کہا: میں اس رب کو سناتا ہوں جو سرگوشیاں سن لیتا ہے، حضرت عمر نے کہا: میں شیطان کو ڈراتا اور اونگھنے والے کو بیدار کرتا ہوں۔ حضرت عمار نے پوچھا: کیا میں وہ آیتیں ملاتا ہوں جو قرآن کی نہیں ہوتیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں، پھر ارشاد کیا: ''یہ تینوں صحیح کر رہے ہیں'' (احمد، رقم ۸۶۵)۔ حضرت عمار بن یاسر مدائن میں چبوترے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھانے لگے تو وہاں موجود حضرت حذیفہ نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور نیچے اتار دیا پھر کہا: آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں سنا: ''جب امام نماز پڑھانے لگے تو مقتدیوں سے اونچی جگہ پر کھڑا نہ ہو۔'' حضرت عمار نے جواب دیا: میں اسی لیے تو نیچے آ گیا تھا (ابوداؤد، رقم ۵۹۸)۔ عہد فاروقی میں جب حضرت عمار کوفہ کے گورنر اور حضرت ابن مسعود والیٔ بیت المال تھے۔ جمعہ کا دن تھا، لوگ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے یہ دیکھ کر کہ سورج کا سایہ ایک مثل کے برابر ڈھل گیا ہے، کہا: تمھارا حاکم اگر تمھارے نبی کی سنت پر عمل کرتا ہے تو ابھی نکل آئے گا۔ ابھی وہ اپنی بات مکمل نہ کر پائے تھے کہ حضرت عمار نماز نماز پکارتے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہوئے آ گئے (احمد، رقم ۴۳۸۵)۔ جمعہ کی نماز میں حضرت عمار عموماً سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے۔ ایک بار حضرت عمار نے ہلکی نماز پڑھائی تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے نماز کو مختصر کر دیا۔ حضرت عمار نے کہا: کیا میں نے رکوع و سجود پورے نہیں کیے؟ اختصار کے باوجود میں نے وہ دعائیں کر لیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مانگا کرتے تھے (نسائی، رقم ۱۳۰۷۔ احمد، رقم ۱۸۲۲۱)۔ حضرت ابووائل کہتے ہیں: حضرت عمار نے ہمیں مختصر اور بلیغ خطبہ دیا۔ ہم نے کہا: ابوالیقظان، آپ چاہتے تو خطاب طویل کر لیتے۔ فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے، کسی مسلمان کی نماز کا لمبا ہونا اور خطبے کا چھوٹا ہونا، اس کی فقاہت کی علامت ہے (مسلم، رقم ۱۹۶۴۔ احمد، رقم ۱۸۲۳۳)۔ حضرت عمار نے فتویٰ دیا کہ جس نے شک کے دن (یعنی جب رمضان کا چاند نکلنا یقینی نہ ہو) روزہ رکھا، اس نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی (ابوداؤد، رقم ۲۳۳۴)۔ حضرت عمار فرضی مسئلوں کا جواب نہ دیتے، کہتے: جب یہ صورت حال واقع ہو گی تو ہم جواب سوچیں گے۔ حضرت عوف بن مالک کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال غنیمت آتا تو اسی روز بانٹ دیتے۔ بال بچوں والے شخص کو دو حصے اور کنوارے کو ایک حصہ عنایت کرتے۔ آپ نے مجھے حضرت عمار سے پہلے بلایا اور دو حصے دیے، کیونکہ میرے بچے تھے، پھر حضرت عمار کو بلایا گیا اور ایک حصہ دیا گیا (ابوداؤد، رقم ۲۹۵۳۔ احمد، رقم ۲۳۸۶۸)۔ ہمیں علم نہیں ہو سکا کہ یہ کب کا واقعہ ہے، شاید اس تقسیم کے وقت حضرت عمار اکیلے ہوں۔ ایک بار حضرت عمار بن یاسر کے ہاتھ پھٹ گئے اور ان کے گھر والوں نے ان پر زعفران لگا دیا۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سلام عرض کیا۔ آپ نے جواب نہ دیا اور فرمایا: جاؤ، اسے دھو کر آؤ (ابوداؤد، رقم ۴۶۰۱)۔ حضرت علی کہتے ہیں: مجھے مذی (pre-seminal fluid) کثرت سے آتی تھی۔ میں نے حضرت عمار بن یاسر سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حل پوچھو، کیونکہ آپ کا داماد ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ آپ سے براہ راست نہ پوچھ سکتا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اس کے لیے وضو ہی کافی ہے، ذکر اور خصیوں کو دھو لو اور وضو کر لو'' (نسائی، رقم ۱۵۴-۱۵۵)۔ بخاری، ابوداؤد اور خود نسائی کی دوسری روایات میں ہے کہ سیدنا علی نے اس ضمن میں حضرت مقداد بن اسود سے مدد لی۔

رؤیت باری تعالیٰ والی حدیث صحابہ کی ایک کثیر تعداد نے روایت کی ہے، حضرت عمار بھی ان میں شامل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل جنت ہر جمعہ کو رب کا دیدار کیا کریں گے۔ جب وہ اپنا حجاب اٹھائے گا تو گویا اس جیسی نعمت انھوں نے اس سے پہلے کبھی دیکھی نہ ہو گی۔ اس روایت کی سند بہت ضعیف ہے۔ حضرت عمار کے پوتے محمد بتاتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا کو دیکھا کہ مغرب کی نماز کے بعد انھوں نے چھ رکعتیں پڑھیں۔ میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نے پوچھا: یہ کون سی نماز ہے؟ انھوں نے کہا: میں نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نوافل پڑھتے دیکھا ہے۔

حضرت عمار بن یاسر کی سوانح تحریر کرنے کے بعد ہم اس حسرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کاش وہ سیدنا عثمان سے عناد نہ رکھتے اور بنو ہاشم سے نہ ہوتے ہوئے بھی اہل بیت کی محبت میں غلو نہ کرتے۔ شاید اس طرح تاریخ اسلامی مختلف ہوتی۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں: ''عمار کچھ معاملات میں عثمان کو برا بھلا کہتے تھے، کاش ایسا نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔ اللہ ان دونوں بزرگوں سے راضی ہو۔'' ابن خلدون شیعہ سلطنت کی نشاۃ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''شروع شروع میں حضرت زبیر، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت مقداد بن اسود دبی دبی زبان میں اس بات کا اظہار کرتے رہے کہ خلافت اہل بیت کو نہ دے کر اچھا نہیں کیا گیا۔ اس وقت راسخ فی الدین صحابہ اور تابعین کی اکثریت تھی، اس لیے بات تاسف و تاسف سے آگے نہ بڑھ سکی۔'' یہ حضرات خلافت کو سیدنا علی کا استحقاق سمجھتے تھے، حالاں کہ خود سیدنا علی نے سیدنا ابوبکر و عمر کی اطاعت کی، بلوائیوں کے سامنے سیدنا عثمان کی صفائیاں پیش کیں، ان کے خلاف جاری شورش کا حصہ نہ بنے، بلکہ آخری دم تک ان کا ساتھ دیا۔ ہو سکتا ہے، ان کے اس طرز عمل کو تقیہ کا لبادہ پہنا دیا جائے۔ تقیہ کی تعریف متعین کرنے والے شیعہ مفسر طبرسی کہتے ہیں کہ تقیہ اس وقت جائز ہوتا ہے جب جان جانے کا اندیشہ ہو جیسا کہ خود حضرت عمار بن یاسر کے ساتھ ہوا۔ آیا پہلے تین خلفا کے عہد میں سیدنا علی کی جان کو حضرت عمار جیسا کوئی خطرہ تھا کہ وہ تقیہ سے کام لیتے؟

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، دلائل النبوۃ (بیہقی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، تاریخ دمشق الکبیر (ابن عساکر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، کتاب العبر و دیوان المبتدأ والخبر (ابن خلدون)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، سیرۃ النبی (شبلی نعمانی)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: H.Reckendorf)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شبلی نعمانی

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں، اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں، ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے، کہ خود اس کے استاد، یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں، جو اپنے اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمران ہیں، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا، تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے۔

سرسید کی جس زمانہ میں نشو و نما ہوئی، دلی میں اہل کمال کا مجمع تھا، اور امرا اور رؤسا سے لے کر ادنیٰ طبقہ تک میں علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے، اس کے بڑے ارکان مفتی صدر الدین خان آزودہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا، اور ان ہی بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی میں جو مشغلۂ علمی اختیار کیا، وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔

نمبر I

اول وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے، آہی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی

مثنوی لکھی، جس کا ایک مصرعہ انھی کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے:

نام میرا تھا کام ان کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، اس لیے وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے، اور نثر کی طرف توجہ کی چونکہ حقائق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا، اس لیے دلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی، اور نہایت محنت و کوشش سے اس کام کو انجام دے کر ۱۸۴۷ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو ''آثار الصنادید'' کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض بعض عمدہ نمونے موجود تھے، خصوصاً میر امن صاحب کی ''چہار درویش''، جو ۱۸۰۲ء میں تالیف ہوئی تھی، اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجودہ تصنیفات کی ہم سری کا دعویٰ کر سکتی ہے، اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا، یعنی عمارات اور ابنیہ کی تاریخ وہ تکلف اور آورد سے اِبا کرتا تھا، تاہم ''آثار الصنادید'' میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی، اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دل دادہ تھے، کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے، اور جو کچھ لکھتے تھے، اسی طرز میں لکھتے تھے۔ سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ''آثار الصنادید'' کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں، جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے تھے۔

بہرحال اس کتاب میں جہاں جہاں انشا پردازی کا زور دکھایا ہے، اس کا نمونہ یہ ہے:

''ان حضرت کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے ارباب فہم و ذکا، اور ناخن فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے سے وا کرتا ہے کہ گرہ جناب کو انگشت موج دریا معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا، کہ زبان سوسن نے کیا کہا، اور رمز شناسی اس مرتبہ کہ واقعی معلوم ہو گیا، کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا، اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو تو نقطۂ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لایتجزیٰ کو دو نیم۔''

اگرچہ اس سے بہت پہلے، یعنی ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا، اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا، جس کا نام ''سید الاخبار'' تھا، اور دونوں پرچوں کی زبان، ضرورت کے اقتضا سے سادہ اور صاف ہوتی تھی، تاہم اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہیں سمجھی جاتی تھی، اس لیے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا، تو اسی فارسی نما طرز میں لکھتا تھا۔ سرسید نے بھی اسی وجہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے ''آثار الصنادید'' میں جہاں انشا پردازی سے کام لیا، اسی طرز کو برتا۔

''آثار الصنادید'' جس زمانہ میں نکلی، اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی، یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے، اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے، اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لیے انھوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا، مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے، جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات، مثلاً رنج وغم، مسرت وخوشی، حسرت وبے کسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے، اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے، کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں، کہ اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔

سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا، وہ ظاہر ہے، اس لیے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

اسی زمانہ میں ہندوستان کے ہر حصہ میں کثرت سے اردو اخبارات جاری ہو گئے، اور انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی اور تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا، اس لیے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے، تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا، اس کے علاوہ جو کچھ تھا، ابتدائی حالت میں تھا۔

۱۲۸۷ھ میں جس کو آج کم وبیش ۲۷ برس ہوئے، سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' کا پرچہ نکالا، اور اردو انشا پردازی کو اس رتبہ پر پہنچا دیا جس کے آگے اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں۔ سرسید نے اردو میں جو باتیں پیدا کیں، اس کو مختصراً ''تہذیب الاخلاق'' میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں، ان کی خاص عبارت ہے:

> ''جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہم نے اردو زبان کی علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی، مضمون[1] کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا، رنگین[2] عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے، اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا، اس[3] میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو، مضمون کے ادا میں ہو، جو[4] اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے، اور دل میں بیٹھے۔''

اس[1] آرٹیکل میں سرسید نے انشا پردازی کے اور بہت سے اصول بتائے ہیں جن کو اس موقع پر ہم اختصار کی وجہ سے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قلم انداز کرتے ہیں۔

سر سید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے، اور جس مضمون کو لکھا ہے، اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر نا ممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گزرے ہیں، لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا، جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔

فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے، سعدی رزم کے مرد میدان نہیں، نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں، لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں، ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے، برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹیکس[۲]، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے، مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔ امید کی خوشی پر ایک مضمون لکھا ہے، جس میں امید کو مخاطب کیا ہے، اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے، اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے، ہات کام میں اور دل بچہ میں ہے، اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے، سورہ میرے بچے سورہ، اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ، اے میرے دل کی کونپل سورہ، بڑھ، اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے، سورہ میرے بچے سورہ، میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ، تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا، تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو تم سے کرے گا، ہمارے دل کو تسلی دیں گی، سورہ میرے بچے سورہ، سورہ میرے بالے سورہ۔

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا، مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا، اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا، اور اماں اماں کہنا سیکھا، اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی، آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کے بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا، رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا۔ سبق عمزدہ دل سے سنانے لگا، اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا، اور اپنے بے گناہ دل بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا، تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں، اور ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہو۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے، لڑائی کے میدان میں جب کہ

بہادروں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں، اورلڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی کڑ کنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اے بہادروں کی قوت بازو! اور اے بہادروں کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال اس کا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔''

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے، اور اس میں کس قدر درد اور اثر پیدا کیا ہے۔

نمبرI

پالیٹیکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔

پنجاب میں جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی جس میں اورینٹل تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا، سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالیٹیکس کی بنا پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے۔ اس وقت سرسید نے پے در پے تین آرٹیکل لکھے، ان آرٹیکلوں کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص ان آرٹیکلوں کے جواب میں سینکڑوں مضامین لکھے گئے، اور ان کا مجموعہ یکجا کر کے ایک مستقل کتاب تیار کی، افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم ان آرٹیکلوں کا کوئی حصہ نقل نہیں کر سکتے۔

سرسید نے انشاء پردازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کیے، ان میں ایک یہ تھا کہ بہت سے اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا، لیکن ترجمہ کے ذریعہ سے نہیں، کیونکہ یہ طریقہ اب تک بے سود ثابت ہوا ہے، بلکہ اس طرح کے انگریزی کے خیالات اردو میں اردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کیے۔ امید کی خوشی کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کیے، دراصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے، انگریزی میں اڈیسن، اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گزرے ہیں، سرسید نے ان کے متعدد مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا۔

سرسید کی انشاپردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے، جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں، اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی، اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اس لیے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے، لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسائل کواس وضاحت، صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دل چسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر رینان نے جوفرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گزرا ہے، اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفی مسائل کو ادا کر سکے''۔ رینان جن مسائل کے ادا کرنے کے لیے عربی زبان کو نا قابل سمجھتا ہے (گو اس کا یہ خیال محض غلط ہے) سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دیے ہیں، سرسید نے فلسفۂ الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہے، وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں۔

زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا، اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔

سرسید کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے، لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ مولوی علی بخش خان صاحب مرحوم جو سرسید کے رد میں رسالے لکھا کرتے تھے، حرمین شریفین گئے، اور وہاں سے سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔ اس پر سرسید ایک موقع پر ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھتے ہیں:

''جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تھے، اور ہماری کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے ہوئے فتووں کے دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں۔

بہ بین کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ　　　که چون خراب شود خانۂ خدا گردو

سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے، کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی، اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے،

باران کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست　　　در باغ لالۂ روید و در شورہ لوم خس''

''تہذیب الاخلاق'' جب بند ہوا ہے، تو سرسید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے، اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

''سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں، کہ جاگ اٹھیں، اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا، اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے، ادھر ہات جھٹک دیا، ادھر پیر جھٹک دیا، اور اینڈے پڑے سوتے رہے، تو بھی توقع ہوئی، کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے، شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آ گئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے، بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے، تو ہم اور پڑے رہیں گے، تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے، بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی!

یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے پی لے،تم چپ رہو، میں آپ ہی پی لوں گا،لو بھائیو!اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو پی لو پی لو۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے اردو انشا پردازی پر جو اثر ڈالا ہے،اس کی تفصیل کے لیے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے، یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے، وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہیں،اور خوب لکھا ہو گا۔ میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جب کہ تمام ملک میں سرسید کا آوازۂ ماتم گونج رہا ہے،اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا شائق ہے، کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیے، میں نے اسی کی تعمیل کی ، ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا، اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا:

اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل

(مقالات شبلی ۲/۵۷-۶۵ ، بہ حوالہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ مئی ۱۸۹۸ء)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

جوابی بیانیوں کا پس و پیش

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پچھلے چند ہفتوں میں علمی، سیاسی، سماجی اور بالخصوص مذہبی حلقوں میں استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کا جوابی بیانیہ گرمی بحث و مباحثہ رہا ہے۔ مجھے میرے بعض احباب نے لکھنے کو کہا، مگر میں نے انکار کر دیا تھا، کیونکہ اس وقت ایک طرف میرے استاذ گرامی ہیں، یہ ناچیز جو کچھ ہے، ان کے فیض تربیت سے ہے، اور دوسری طرف محترم تقی عثمانی صاحب ہیں، جو حلقۂ دیوبند کے ایک مجتہد صفت عالم دین ہیں۔ میں دونوں کا احترام کرتا ہوں اور قلم اٹھانے کو خلاف آداب سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ہماری مشرقی روایت ہمیں یہی سکھاتی ہے۔

لیکن اب بہت کچھ لکھا گیا ہے اور تقریباً ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں نے اپنے اپنے رشحات قلم سے مختلف فورمز پر صفحہ ہائے قرطاس و نیٹ کو مزین کیا ہے۔ اس بحث کے بارے میں کسی موقف کی تائید یا تردید میرے پیش نظر نہیں ہے، بلکہ چند اصولی مباحث چھیڑنا چاہتا ہوں تا کہ اس مسئلے کی نزاکت اور اس کے تاریخی جبر کو سمجھا جا سکے۔

پہلی بات: نقد کیسا ہو؟ میری نظر میں پچھلی چند صدیوں کا تنقیدی لٹریچر جو گزرا ہے، اس کے مطالعہ کی روشنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ افسوس اس بات پر ہے کہ جب ہمارا جید سے جید عالم، جس نے اپنی علمی وجاہت کو منوایا ہو، وہ بھی جب قلم اٹھاتا ہے تو یا تو وہ کسی جزیئے میں پھنس جاتا ہے یا وہ مخالف فریق کے نظریے پر اپنے اصولوں کی روشنی میں نقد کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں جو تنقید ہوئی، وہ اپنے اپنے اصولوں کے لحاظ سے مضبوط تھی، مگر استاذ گرامی کے اصولوں کے لحاظ سے برمحل اور درست نہیں تھی۔ مثلاً استاذ گرامی کے نزدیک اسلام کا ماخذ محض قرآن و سنت ہیں۔ تقی عثمانی صاحب جس فقہی روایت کے امین ہیں، وہ اس روایت کو بھی دین کا ماخذ سمجھتے ہیں۔ استاذ گرامی کی نظر میں وہ چیز

اسلامی نہیں ہے جو قرآن و سنت سے ماخوذ نہ ہو، جبکہ تقی عثمانی صاحب کے نزدیک وہ اسلامی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ فرق ہے، جو اس تنقیدی گہما گہمی کا باعث ہے۔ اسی طرح شاید عثمانی صاحب ریاست اور حکومت میں فرق نہیں کرتے، حکومت اسلامی اور غیر اسلامی ہوا کرتی ہے، ریاست کبھی بھی اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہوتی۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ آپ کسی محلے یا گلی کوچے کو اسلامی کہنا شروع کر دیں، حالاں کہ وہاں کے باشندے اسلامی یا غیر اسلامی ہوں گے۔

میرے خیال میں صحیح تر نقد وہ ہو گا جو یا مخاطب کے اصولوں پر ہو یا اس کے اصولوں کو مانتے ہوئے اس کی آرا پر ہو، وگرنہ آپ کا نقد غیر مؤثر رہ جاتا ہے، محنت رائگاں چلی جاتی ہے۔ تیسری صورت نقد کی یہ ہو سکتی ہے کہ صرف ان باتوں پر کھڑے ہو کر نقد کیا جائے جو دونوں فریقوں کے مابین مشترک ہوں۔ اسے میں آفاقی نقد کا نام دیتا ہوں۔ اس میں اصول اور آرا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، بلکہ وہ مسلمہ آفاقی اصول ہوتے ہیں جو ہم مذہب و ہم مشرب افراد میں مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی رائے میں یا کسی نظریے میں اگر اس سے انحراف ہو تو آپ یقیناً ایک مفید نقد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سارے عرصے میں ایسا نقد خال خال ہی نظر آتا ہے۔

دوسری بات: سماج کیا ہے؟ یہ کیسے بدلتا ہے؟ اس کو بدلنے والے کون لوگ ہیں؟ جوابی بیانیے کی اس بحث کا ہدف پاکستان کی سماجی ابتری ہے۔ اس میں پائے جانے والے بیانیے ہیں۔ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سماج کو بنانے والے تین عوامل ہیں: ۱۔ بیانیہ، ۲۔ بیانیے کے حامل افراد اور ۳۔ کارفرما قوتیں۔ بیانیہ دراصل بیانیے کے حامل افراد کے نظریات، مفادات اور دل چسپیوں (interests) کا نام ہے۔ مثلاً علما مذہبی بیانیے کے حامل ہیں۔ جس کے ساتھ ان کے دین و دنیا کے interests وابستہ ہیں، سیکولر بیانیے کے حامل افراد کے interests کی حصولی سیکولرازم کے قیام و بقا کے مرہون منت ہے۔ کارفرما عناصر سے ہماری مراد بزنس کلاس، بیوروکریسی، سیاست دان اور حکمران طبقہ ہیں۔ ان کے مفادات اور interests جس رخ پر بیٹھیں معاشرے میں ان کو ترویج دی جاتی ہے۔ اس کے لیے دونوں طبقات میں سے ہم خیال لوگوں کو برتا جاتا ہے۔ جو معاشرے کو پسندیدہ رخ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے بیچوں بیچ ایک اور طبقہ ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ وہ ان ذہین افراد کا گروہ ہوتا ہے جس کی نگاہ ان امور پر ہوتی ہے کہ جب ایک بیانیہ معاشرے کے لیے قابل عمل نہ رہے یا وہ خرابی کا باعث بن رہا ہو، تو وہ افراد متبادل بیانیے دینے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے معاشرہ پھر سے اپنی ڈگر پر چل پڑتا ہے۔ فساد رفع ہو جاتا ہے اور نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ استاذ گرامی کے خیال میں روایتی بیانیہ اپنے اسی مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اب ایک نئے بیانیے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں، ان کے نزدیک روایتی بیانیہ نہ صرف اگلے دور کے لیے ناقابل عمل ہے، بلکہ وہ اس ملک میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فساد کا باعث بھی ہے۔ اس لیے اب ضرورت ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں نیا بیانیہ ملک کو دیا جائے۔

ایسا کرنے سے متعدد بیانیے وجود میں آجاتے ہیں، لیکن قوت ہمیشہ زیرعمل بیانیے کے پاس ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کے حاملین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک چیز اور عمل میں آجاتی ہے کہ یہ متعدد بیانیے اپنے اپنے حاملین پیدا کر لیتے ہیں، جس سے معاشرے میں نیا خون آہستہ آہستہ سرایت کرنے لگتا ہے۔ کچھ لوگ نئے بیانیے میں ملک وقوم کے لیے نجات محسوس کرتے ہوئے اسے اپنا لیتے ہیں، اور کچھ روایتی بیانیے کو ایسا ہی خیال کرتے ہوئے اسے اپنائے رکھتے ہیں۔ لیکن نئے بیانیے اپنا ایک کام خاموشی سے کرتے رہتے ہیں۔ روایتی بیانیے والے مرور وقت کے ساتھ اپنے ہاں جزوی تبدیلیاں لاتے جاتے ہیں، اور نئے بیانیے کو جزوًا جزوًا قبول کرتے کرتے پورے بدل جاتے ہیں۔ کبھی ایک ہی نسل میں اور کبھی اگلی کئی نسلوں میں۔ اور نئے بیانیے کو اپنانے والے معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے روایتی بیانیے کی کچھ چیزوں کو اپنائے رکھتے ہیں۔ یوں ترک وقبول کی کڑیاں اگلی کڑیوں سے مسلسل جڑتی جاتی ہیں اور چند دہائیوں ہی میں غیر محسوس طریقے سے نیا سماج وجود میں آچکا ہوتا ہے۔ اپنے ملک کی چند دہائیوں کا جائزہ لیجیے: تصویر کی حرمت کے قائل علما نے ٹی وی کی تصویر کو حلال کیا ہے، اور اس کے ہر چینل پر زینت افروز نظر آتے ہیں۔ بعض علما نے پتلون پہننی شروع کر دی ہے، ٹی وی جس کی حرمت کے فتوے تھے، ہر مذہبی و غیر مذہبی کے گھر کی زینت ہے۔ فلم جسے کبھی عام شرفا بھی چھپ کر دیکھتے تھے، اب بہت سے علما بھی بلاخوفِ عوام دیکھتے ہیں۔ جان جس کی حرمت سب سے بڑھ کر تھی، اس کی بے حرمتی کا قبیح منظر ہمارے سامنے ہے۔ پردہ جو اس معاشرے کا نہایت نمایاں مظہر تھا، وہ کم لباسی کا رخ اختیار کر چکا ہے۔ دائیں ہاتھ سے نوالہ توڑ کر کھانا ایک تہذیبی عنصر تھا، اب دونوں ہاتھ سے پکڑ کر نوچ نوچ کر کھانا نئی تہذیب کا پسندیدہ طرز ہے۔ کوئی بیانیہ ان تبدیلیوں کو نہیں روک سکا۔ مثلاً تصویر کی حرمت کا کوئی فتویٰ، نہ کیمروں کی خرید وفروخت پر اثر انداز ہوا ہے اور نہ تصویر کشی کے فن پر، اس لیے کہ اس روایتی بیانیے میں جان نہیں رہی، کچھ ہماری کوتاہ بیانی سے اور کچھ مغرب کی ریشہ دوانی سے۔

استاذ گرامی نے جو بیانیہ دیا ہے، وہ نوشتۂ دیوار ہے۔ اسے جس قدر چاہے نقد سے اڑا دیں، وہ اپنا خاموش عمل شروع کر چکا ہے۔ یہ تاریخ کا جبر ہے، یونہی ہوتا آیا ہے، ہوتا رہے گا۔ اس بیانیے کو سننے والے پریشان نہ ہوں، یہ بیانیہ اتنا ہی اپنایا جائے گا، جتنا کارفرما عناصر کو قابل قبول ہوگا۔ اس کے باقی اجزا انھی اوراق کی زینت بنے تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ استاذ گرامی کے بیانیے کے حاملین کو صبر سے کام لینا ہوگا، ان کا بیانیہ اتنی جلدی نہیں اپنایا جائے گا۔ اس کے لیے دہائیوں اور بعض اوقات صدیوں کا وقت بھی لگ جاتا ہے، اس لیے کہ آج روایتی بیانیہ کا دور دورہ

ہے۔ وہ اگرچہ زوال پذیر ہے، مگر ہاتھی گرتے گرتے بھی وقت لیتا ہے۔ اس کو تاریخ کے آئینے میں دیکھیے: معتزلہ کو دین سے خارج کیا گیا، آج تمام اشعری بہت سے معتزلی نظریات کے حامل ہیں۔ ابن تیمیہ کو زندیق وفتنہ کہا گیا، آج ان کا تصورِ حدیث اور تعبیر دین احناف وشوافع کا نظریہ ومسلک ہے۔ ابن حزم ظاہری کو بے استادہ اور نکما کہا گیا، آج حنبلی فقہ اس کی اسیر ہے، اور احناف وشوافع بھی اثر پذیری سے محفوظ نہیں ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے چند دہائیاں قبل ایک بیانیہ دیا تھا، جو اس وقت نیا تھا، مگر آج وہی ہر عالم دین کا بیانیہ ہے۔ لیکن یہ تمام اثرات خاموشی سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ ہاں اکا دکا لوگ علانیہ بھی بیانیہ تبدیل کرتے (یہ جرأت رندانہ خال خال نظر آتی ہے) اور ان میں سے بعضے پھر اسے ترک کر دیتے ہیں۔

تیسری بات: کیا روایتی بیانیہ دینی بیانیہ ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہ بیانیہ تو روایتی بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں اسے روایتی نہیں، بلکہ contemporary narrative کہنا چاہیے۔ یہ بھی عہد استعمار میں مابعد اقبال پیدا ہوا ہے۔ ہم شاعر مشرق کے بیانیہ کے حامل ہیں، نہ کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ علامہ اقبال نے اس مایوسی کی فضا، جو سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں میں موجود تھی، کو ختم کرنے کے لیے ایک انقلابی بیانیہ دیا تھا، جسے بعد میں سیاسی وعملی میدان میں مودودی صاحب اور فکری میدان میں بہت سے اصحاب علم نے آگے بڑھایا تھا۔ اس بیانیے کے پیچھے جمال الدین افغانی، سرسید، قاسم نانوتوی، شبلی اور اقبال وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ آج کا بیانیہ ان کا تشکیل کردہ ہے۔ ھم رجال و نحن رجال۔ اس بیانیے کو قرآن وسنت کی سند حاصل نہیں ہے۔ وہ بات جو علما مانتے ہوں، وہ لازم نہیں کہ دینی طور پر درست بھی ہو۔ مثلاً زمین ساکن ہونے کا نظریہ علما کا نظریہ تھا، تو آیا یہ نظریہ دینی ہو گا؟ یقیناً نہیں۔ بلاشبہ، اس بات کا امکان ہے کہ اس طرح کے امور میں، جہاں نصوص خاموش ہوتے ہیں، کسی صاحب علم کی رائے عین قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا امکان ہے کہ اس کی بات محض اس کی اپنی رائے ہو۔ کم از کم ہمارے موجودہ بیانیے کی یہی حقیقت ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ بیانیہ کیسا بھی ہو، جب وہ ذہنوں میں تسلیم شدہ حالت میں موجود ہو تو نصوص قرآنی بھی ویسی ہی دکھائی دینے لگ جاتی ہیں۔ ان کے معنی بیانیہ کی روشنی میں ذہن تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً مولانا مودودی کی تفسیر قرآن اس انقلابی بیانیہ کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح نصوص اس تفسیر میں اپنا رخ بدلتے جاتے ہیں۔ اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ ہم جس بیانیے کو قرآنی کہہ رہے ہوں، وہ محض ہمارا حسن نظر ہو۔ لہٰذا نئی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی، محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ بات نئی ہے یا یہ بات علما کے نزدیک غلط

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہے۔ زمین ساکن ہے، کو اگر ہم صرف اس وجہ سے مانتے رہیں کہ یہ ہمارے روایتی علما کا نظریہ تھا، تو یہ دراصل حقائق کا انکار کرنے کے مترادف ہوگا:

آئینِ نو سے ڈرنا ، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی

حکومت اسلامی کے قیام کی شرط اول

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: آپ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ''حکومت اسلامی کا قیام ایک آزاد اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے''۔ اس نظریہ کا ماخذ کیا ہے، کتاب وسنت میں اس کی اصل کیا ہے اور فقہ کی تقسیم احکام میں یہ چیز کس طرح چسپاں ہوتی ہے؟ واضح ہو کہ یہ سوال بطور اعتراض نہیں ہے۔ مجھے آپ کی یہ بات بہت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے نزدیک وہ کون سے دلائل ہیں جن سے آپ یہ تصور اخذ کرتے ہیں؟

جواب: حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی، بہرحال وہ ایک بالغ معاشرہ ہی سے وجود میں آتی ہے۔ معاشرہ ہی ترقی کرتے کرتے جب اپنی آزادی اور استقلال کے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے تو حکومت کو جنم دیتا ہے جو ٹھیک ٹھیک اس کے مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر معاشرہ کی اٹھان جاہلی اور غیر اسلامی نظریات پر ہوئی ہوتی ہے تو اس کے بطن سے غیر اسلامی طرز کی حکومت جنم لیتی ہے اور اگر معاشرہ کی اٹھان اسلامی طریقہ پر ہوئی ہوتی ہے تو اس سے ایک اسلامی حکومت وجود پذیر ہوتی ہے۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اسلام میں احکام وقوانین کے نزول کی ترتیب وتدریج بالکل معاشرہ کے تدریجی ارتقا کے قدم بہ قدم ہے۔ معاشرہ جس رفتار سے بچپن، مراہقہ اور بلوغ کے ادوار میں داخل ہوا، اسی مناسبت سے ہر دور کے تقاضوں کے مطابق احکام وقوانین اترے۔ یہاں تک کہ ایک حکیم سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں ہو سکتی کہ پہلے دور کے احکام میں جو تقاضے دوسرے یا آخری دور سے متعلق مضمر تھے، وہ پہلے دور میں

واضح نہیں کیے گئے، بلکہ اس وقت واضح کیے گئے جب ان کے اظہار کے لیے مناسب دور آ گیا۔ اس کے لیے توحید اور رسالت پر ایمان کے مقتضیات کے تدریجی انکشاف پر غور کرنے سے میری بات کی تصدیق ہو گی۔

اسی بنیاد پر، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، ہمارے فقہا اجراے حدود اور نفاذ احکام سے متعلق بہت سے معاملات میں دارالاسلام یا بہ الفاظ دیگر ایک آزاد خود مختار معاشرہ کے وجود کی شرط لگاتے ہیں اور دارالکفر میں ان کے اجرا و نفاذ کی اجازت نہیں دیتے۔

ان باتوں کا حوالہ دینے سے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے شرط اول اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہے۔ اس زمانے میں صحیح لفظوں میں اسلامی معاشرہ کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ جن ملکوں میں مسلمان ایک مظلوم و مقہور اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا تو مسئلہ ہی خارج از بحث ہے۔ خالص مسلمان ملکوں کا حال بھی اس زمانہ میں یہ ہے کہ جن اساسات پر اسلامی معاشرہ قائم ہوتا ہے، وہ سب ان میں منہدم اور جاہلیت کے ملبوں کے نیچے دبی ہوئی ہیں۔ ایسے حالات میں جو لوگ اسلامی نظام کے قیام کے خواہاں ہیں، ان کا مقدم فرض یہ ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں پر معاشرہ کی تعمیر کی جدوجہد کریں اور اسی تدریج و ترتیب کے ساتھ اس کو آگے بڑھائیں جس تدریج و ترتیب کے ساتھ اس کو قرآن اور پیغمبر نے آگے بڑھایا تھا۔ اس بنیادی کام کے بغیر جو لوگ ''انقلاب قیادت'' اور ''حکومت الٰہیہ'' کا نعرہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ہم ان کے کام کو اسلامی نقطۂ نظر سے نہ صرف بے نتیجہ، بلکہ بعض پہلوؤں سے نہایت مضر خیال کرتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ یا تو درخت لگائے بغیر پھل کھانا چاہتے ہیں یا اندرائن اور گلوئے نیم کی بیلوں سے انگور کے خوشے توڑنا چاہتے ہیں۔

ایک مزید سوال

سوال: میرا سوال غالباً پوری طرح واضح نہ ہو سکا۔ اصل میں یہ بات کہ ''حکومت اسلامی کا قیام ایک آزاد اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے''۔ اس کے کچھ متعلقات ہیں جو نظریاتی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی قوانین اور شرعی حدود کے نفاذ کا مخاطب صرف مسلمانوں کا وہ گروہ ہے جو آزاد اور بااختیار حیثیت کا حامل ہو، متفرق اور غیر آزاد اہل ایمان کے اوپر اس کی تکلیف نہیں ہے۔ اور جب وہ اس کے مخاطب اور مکلّف نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ان کے اوپر یہ ذمہ داری بھی نہیں ہے کہ وہ جدوجہد کر کے وہ حالات پیدا کریں جب وہ اس قسم کے احکام کو نافذ کر سکیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسی مخصوص پہلو کے اعتبار سے اس معاملہ میں آپ کا استدلال میں جاننا چاہتا تھا۔ اگر ممکن ہو تو تحریر فرمائیں۔

جواب: اسلام کے احکام وقوانین پر غور کیجیے گا تو معلوم ہو گا کہ وہ بہ اعتبار ادوار تین حصوں میں تقسیم ہیں اور تینوں اپنے مزاج کے لحاظ سے الگ الگ ہیں: ایک حصہ ان احکام وتعلیمات پر مشتمل ہے جو تشکیل معاشرۂ اسلامی سے متعلق ہیں۔ دوسرا حصہ عبوری دور کے احکام پر مشتمل ہے (یہی وہ حصہ ہے جس میں بعد میں حالات کی تبدیلی سے نسخ واقع ہوا)۔ تیسرا حصہ ان احکام پر مشتمل ہے جو براہ راست اسلامی حکومت سے متعلق ہیں۔ دور اول کے احکام کا مزاج قدرتی طور پر غیر سیاسی ہے۔ عبوری دور کے احکام میں آگے اور پیچھے کے دونوں دوروں کے تقاضے ملے جلے ہیں۔ تیسرے دور کے احکام اس اعتبار سے تمام تر سیاسی نوعیت کے ہیں کہ صرف ایک حکومت ہی ان کی حامل ہو سکتی ہے اور اسی کے ہاتھوں ان کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔

اسلام کے یہ احکام چونکہ اسی ترتیب کے ساتھ نازل ہوئے، اس وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدر اول کے مسلمانوں کو کوئی گھپلا پیش نہیں آیا۔ احکام ٹھیک اپنی فطری ترتیب کے مطابق نازل ہوئے اور اسی ترتیب کے مطابق ان کی تبلیغ واشاعت یا تنفیذ عمل میں آئی۔ اب اس زمانہ کے لوگوں کو یہ گھپلا پیش آ رہا ہے کہ پورا دین نازل شدہ ان کے سامنے موجود ہے اور اس کے مختلف النوع احکام کے درمیان ایسے فاصل خطوط نہیں ہیں جن کی مدد سے ایک عام آدمی ان کے درمیان امتیاز کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ غیر حکیم داعیوں نے یا تو معاشرے کے حالات کا لحاظ کیے بغیر محض اپنے پروگرام کو حاوی اور ہمہ گیر دکھانے کے شوق میں پورے دین کی دعوت کا نعرہ بلند کر دیا یا ابتدائی مراحل کو چھوڑ کر محض سیاسی قسمت آزمائی کے خبط میں آخری مرحلہ میں داخل ہو گئے۔ یہ صورت حال نہ صرف غیر حکیمانہ ہے، بلکہ بعض حالات میں نہایت خطرناک بھی ہے۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں تو ممکن ہے کہ اس بے تدبیری کا ضرر صرف اسی حد تک محدود رہے کہ اس قسم کی تمام مساعی بالکل عبث اور بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں، لیکن جہاں مسلمان خطرات میں گھری ہوئی ایک مظلوم اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، وہاں تو یہ غلط طرز عمل نہ صرف اسلام کے خلاف ذہنوں میں (مسلموں اور غیر مسلموں، دونوں کے) شدید قسم کی الجھنیں پیدا کر دے گا، بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ اس کا ردعمل ایسی صورت میں ظاہر ہو کہ وہاں اسلام اور مسلمانوں کو شدید قسم کا نقصان پہنچ جائے۔ سوچیے کہ اگر غیر مسلموں کے کسی ملک میں کچھ مسلمان اسلام کے داعی بن کر جائیں اور اپنی دعوت کا آغاز وہ اس نکتہ سے کریں کہ ہم یہاں اسلام کی حکومت قائم کرنے یا انقلاب قیادت کے لیے آئے ہیں، تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟

اس میں تو شبہ نہیں کہ یہ کہنا حوصلہ کا کام ہے، لیکن کیا ساتھ ہی یہ ایک حماقت کی بات نہیں ہے؟ دنیا کے بے شمار ملکوں میں مسلمانوں نے اسلام کی دعوت دی جن میں سے بہتوں میں اسلام کی حکومتیں بھی بعد میں قائم ہو گئیں، لیکن بتائیے کہ کس جگہ انھوں نے حکومت الٰہیہ کی دعوت یا انقلاب قیادت کے نعرہ سے اپنے کام کا آغاز کیا؟ ان داعیوں کے متعلق اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ان کی دعوت ادھوری تھی یا ان کو پورے دین کا شعور نہیں تھا تو میں ایسے شخص کو اسلامی نظام کے شعور سے بالکل محروم خیال کرتا ہوں۔

یہ نہ خیال فرمائیے کہ جس وقت ایک داعی ایک غیر اسلامی معاشرہ میں ایمان و اسلام کی بنیادی اور تعمیری دعوت شروع کرتا ہے تو وہ دین کے دوسرے اجتماعی و سیاسی مطالبات کو نظر انداز کرتا ہے یا اپنے آپ کو وہ ان کا مخاطب یا مکلّف نہیں سمجھتا یا وہ ان کے نفاذ کے لیے حالات پیدا کرنے کی جدوجہد نہیں کرتا۔ وہ اپنے اسی تعمیری اور تمہیدی کام کے ساتھ یہ سارے کام کر رہا ہوتا ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ میں دین کے ان مطالبات کا مخاطب و مکلّف اپنی انفرادی حیثیت میں یا اس حالت میں نہیں ہوں، جبکہ میں اپنے گرد و پیش صرف کچھ منتشر افراد رکھتا ہوں، بلکہ صرف اسی صورت میں ہوں جب اس دعوت سے ایک ایسا منظّم اور بااختیار معاشرہ وجود میں آجائے جو ان مطالبات کے اجراو تنفیذ کے لیے مؤثر اقدام کر سکے۔ اس سے پہلے کی ساری جدوجہد اس کے اسی آخری منصوبہ کی تمہید ہوتی ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ اس آخری سرحد تک پہنچنا خدا کے فضل و رحمت پر منحصر ہے۔ اس وجہ سے وہ دین کے جس مرحلہ کا کام کر رہا ہوتا ہے، اسی کے لیے پکارتا ہے اور چونکہ ہر مرحلہ کی دعوت اپنے اندر دلوں اور روحوں کے لیے ایک فطری اپیل رکھتی ہے، اس وجہ سے اگر وہ اخلاص و استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے تو اس کی جدوجہد کو آخری منزل تک بھی پہنچا تا ہے۔ اگر اس سے پہلے ہی اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو اس کی موت ایک مجاہد فی سبیل اللہ کی موت ہوتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک کامیاب آدمی ہوتا ہے، اس کو ناکام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اور اگر وہ اپنی بے تدبیری سے یا محض سیاسی اقتدار کے حصول کے شوق میں وہ بوجھ اپنے سر پر اٹھانے یا دوسرے اپنے گرد و پیش کے پراگندہ افراد کے سروں پر لادنے کی کوشش کرے جو بوجھ ایک منظّم اور بااختیار اسلامی معاشرہ ہی کے اٹھانے کا ہے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں نکل سکتا کہ خود اس کی کمر بھی ٹوٹ کر رہ جائے اور دوسروں کی بھی، نیز سارے ماحول میں اسلام کی دعوت ایک خبط و جنون کا نعرہ یا ایک مذاق سمجھی جانے لگے۔

معاف کیجیے گا! آپ حضرات اگر ایک بات ٹھیک کہتے ہیں تو اس کے ساتھ اسی سانس میں دوسری بات بالکل غلط بھی کہتے ہیں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اسلام صرف مسجد کا دین نہیں ہے، بلکہ حکومت کا بھی دین ہے، لیکن یہ بات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بالکل غلط ہے کہ اسلام کی دعوت ہر معاشرہ اور ہر ماحول میں حکومت الٰہیہ یا انقلاب قیادت کی دعوت سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بڑی ہی شدید غلط فہمی، بلکہ شدید قسم کی جہالت ہے جس کی جس قدر جلدی اصلاح ہو جائے اچھا ہے۔ اسی غلط نظریہ کا نتیجہ ہے کہ آج اقامت دین کے علم برداروں کا واحد نصب العین صرف حکومتی اقتدار رہ گیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اقتدار ہمارے حوالہ کرو، ہم چشم زدن میں خلافت راشدہ قائم کیے دیتے ہیں۔ اب یہ بات ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی کہ اسلامی حکومت مطالبہ کرنے کی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ ایک قدرتی نتیجہ ہے ایک صحیح قسم کے اسلامی معاشرہ کے صحت مندانہ بلوغ کا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ راستہ بڑے صبر و ریاض کا ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ راستہ ہے یہی۔ اس کے لیے جو لوگ انتخابات کے راستہ پر اعتقاد رکھتے ہیں، مجھے ان کی سادہ لوحی پر تعجب ہوتا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے ہمیں حکومت بھی نہ دی تو پھر کیا دیا۔ اس جذبہ کے تحت وہ اسلام کی بات ہی حکومتی اقتدار سے شروع کرتے ہیں۔ میں اس بات کو ایک بالکل جذباتی چیز سمجھتا ہوں۔ اسلام نے حکومت کی نہیں، بلکہ ہدایت اور نجات کی ذمہ داری لی ہے، ہاں اگر صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آ جائے تو اس کے اوپر وہ احکام آپ سے آپ فرض ہو جاتے ہیں جو حکومت سے متعلق ہیں اور اس وقت یہ بات بالکل صحیح ہو گی کہ آپ اس کو اس کی ذمہ داریاں بتائیں۔ ننھے بچوں کے سامنے جوانی کی ذمہ داریوں پر تقریر کرنا ایک بالکل بے ہنگام بات ہے۔

(تفہیم دین ۱۳۷-۱۴۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امین احسن اصلاحی

مولانا ابوالکلام آزاد

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پاکستان اور ہندوستان کے متعدد مخلصین نے ہمیں کراچی کے ایک معاصر کے ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جو معاصر مذکور کی مارچ کی اشاعت میں ''پردہ اٹھنے کے بعد'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ پورا مضمون نہایت ہی توہین آمیز اور حد درجہ دل آزار ہے۔ یہ معاصر مولانا مرحوم کے متعلق اسی قسم کا ایک دل آزار مضمون اس سے پہلے بھی شائع کر چکا ہے۔ مولانا آزاد معاصر مذکور کی نظر میں جیسے کچھ بھی ہوں، لیکن اب وہ اپنے رب کے پاس جا پہنچے! وفات پا جانے والوں سے متعلق ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت یہ ہے کہ اگر ان کی کچھ بھلائیاں ہمارے علم میں ہوں تو ان کا ذکر کریں، ورنہ کم از کم ان کی لغزشوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ مولانا کے وفات پا چکنے کے بعد ان کا پردہ اٹھانے کی سعی میں سرگرم ہیں، ان کے سینے ہمارے نزدیک خوف خدا سے بالکل خالی ہیں۔ وہ اپنے اس رویہ سے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کر رہے ہیں کہ وہ اسی دنیا میں ان کے پردے چاک کرے۔

مولانا آزاد مکہ میں نہیں پیدا ہوئے کھیم کرن میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کوئی بڑے عالم نہیں تھے، بلکہ مسجد کو رہن رکھنے والے اور بدعتی آدمی تھے۔ سوال یہ ہے کہ ان تحقیقات سے اقامت دین کے اس نصب العین کو کیا تقویت پہنچ رہی ہے جس کے یہ حضرات کل تک علم اٹھائے پھر رہے تھے! مولانا آزاد میں جو بڑائیاں اور خوبیاں تھیں، وہ یہ نہیں تھیں کہ وہ بہت بڑے باپ کے بیٹے یا کسی بہت بڑی درس گاہ سے نسبت رکھنے والے تھے، بلکہ یہ ساری خوبیاں ان کی ذاتی خوبیاں تھیں اور وہ اتنی شان دار تھیں کہ ان کے بدتر سے بدتر حاسد بھی ان کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر

سکتے۔مولانا آزاد نے دوسروں کی نسبت سے خود شرف حاصل نہیں کیا، بلکہ اپنی نسبت سے دوسروں کو شرف بخشا۔

مولانا کی عربی دانی کی بحث بھی ایک غیر ضروری اور غیر مفید بحث ہے۔اور اگر یہ بحث کچھ مفید بھی ہے تو بہر حال ان لوگوں کے اٹھانے کی نہیں ہے جو خود عربی، فارسی، انگریزی، ہر چیز سے بے بہرہ ہیں۔

مولانا پر یہ طنز بھی ہمارے نزدیک ابھی قبل از وقت ہے کہ 'بھارت میں گائے کے ذبیحہ کی ممانعت سے لے کر توہین رسول تک کے اندوہناک واقعات رونما ہو گئے، مگر حزب اللہ کے موسس امام الاحرار مولانا محی الدین المکنی بابی الکلام الدہلوی دم سادھے بیٹھے رہے!'

مولانا پر یہ طنز اس وقت موزوں رہے گا جب یہ حضرات بھارت کے کفرستان میں نہیں، بلکہ پاکستان کے اسلامستان میں، جو سو فی صد مسلمانوں کا ملک ہے اور اسلام ہی کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، کچھ کر کے دکھا سکیں۔ ابھی تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن حضرات کو اپنے ناخن تدبیر کی جولانیوں پر بڑا ناز تھا، رشتہ میں ایک ہی گرہ پڑ جانے سے، وہ اس طرح چکرا گئے ہیں کہ گرہ کھولنے کے بجائے سر کھجانے میں مصروف ہیں:

اس بے بسی میں یارو، کچھ بن پڑے تو جانیں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

بہر حال، مولانا مرحوم کے متعلق اس طرح کی بحثیں جو لوگ چھیڑ رہے ہیں، ان کے ظرف کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔مولانا آزاد ان حضرات کے نزدیک واقدی کی طرح کذاب ہیں۔لیکن ان کی یہی ایک خوبی ان حضرات کی تمام خوبیوں پر بھاری ہے کہ ان کی ذات پر جب بھی اس قسم کے شریفانہ حملے کیے گئے تو انھوں نے ان کا نوٹس نہیں لیا، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ اپنے اس قسم کے کرم فرماؤں کے ساتھ ان کی مشکلات میں انھوں نے نہایت اچھا سلوک کیا۔ان کی طبیعت میں بڑی بلندی تھی اور اس بلندی کی وجہ سے وہ لوگوں کی حاسدانہ باتوں کی کبھی پروا نہیں کرتے تھے۔پھر یہ بات بھی تھی کہ ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی عظمت و شہرت عطا فرما دی تھی کہ ان کو اپنی شہرت و عظمت کی تعمیر کے لیے دوسروں کی شہرت پر حملہ کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔

مولانا آزاد جیسے لوگوں پر اگر کسی کو بحث کرنی ہو تو ان کے افکار و نظریات پر کرے۔اس لیے کہ اس طرح کے لوگوں کے افکار و نظریات سے ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔مولانا آزاد کے بعض افکار و نظریات سے ہمیں بھی اختلاف ہوا ہے اور ہم نے اپنے اس اختلاف کا اپنی تحریروں میں اظہار بھی کیا ہے، لیکن اس اختلاف کے باوجود ہماری نظروں میں ان کی عزت و عظمت کبھی کم نہیں ہوئی۔اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، ان کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لغزشوں سے درگذر فرمائے اور ان کی ذات پر اس قسم کے 'شریفانہ' حملے کرنے والوں کو توفیق دے کہ یہ اپنے زبان و قلم کی صلاحیتیں کسی مفید مقصد کے لیے استعمال کریں اور دوسروں کا پردہ اٹھانے کے بجائے اپنا پردہ قائم رکھنے کی کوشش کریں!

معاصر موصوف نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ مولانا مرحوم کے سارے تربیت یافتہ ملحد اور بے دین ہیں اور اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ مولانا بھی ایک ملحد و بے دین تھے۔ یہ نکتہ اگر صحیح ہے تو کیا یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اسی نکتہ کی روشنی میں ان بزرگوں کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے جن کے فیض تربیت کا یہ مظاہرہ معاصر موصوف نے کیا ہے اور جن کو اپنے صفحات میں وہ ہم رتبۂ ابن تیمیہ وشاہ ولی اللہ قرار دیتا رہا ہے۔

(مقالات اصلاحی ۴۰۸/۲، بہ حوالہ ماہنامہ میثاق لاہور-اپریل ۱۹۶۰ء)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

O

وہ اہل درد جو غم کو شعار کرتے ہیں

اُنھی کا اہل جہاں اعتبار کرتے ہیں

یہ ایک جان تھی ، دوبھر ہوئی رقیبوں کو

لو آج اِس کو بھی ہم نذر یار کرتے ہیں

کسے خبر ہے کہ ہوش و خرد پہ کیا گزرے

وہ اپنی زلف کو پھر تاب دار کرتے ہیں

اگر نہیں گل و لالہ ، سرشک خون تو ہیں

اِنھی سے دشت کو باغ و بہار کرتے ہیں

یہ دور وہ ہے کہ جس کی زباں پہ ہو دشنام

اُسی کو دوش پہ اپنے سوار کرتے ہیں

مقام صبر سے وہ بے نوا فقیروں کو

سنا ہے اپنے لیے اختیار کرتے ہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ خواجگی ہے تو اک دن غریب کی آہیں
وہی کریں گی جو خس میں شرار کرتے ہیں

اُدھر بھی کھینچ بلاتا ہے حسن کا جلوہ
ہم اپنا رخ جو کبھی سوے دار کرتے ہیں

کوئی ہو مانگنے والا کہ چرخ زیریں پر
وہ روز آ کے یہی انتظار کرتے ہیں

جنھیں خود اپنا زیاں بھی نظر نہیں آتا
اُنھیں اب اہل نظر میں شمار کرتے ہیں

نہیں جو خوب اُسے خوب کس طرح کہہ دیں
یہی خطا ہے جو ہم بار بار کرتے ہیں

مرے عزیز، یہ دنیا بدل نہیں سکتی
اِسی کو اپنے لیے سازگار کرتے ہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org